نیرنگِ خیال
اوّل و دوم
محمد حسین آزاد
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

معیاری ادب نمبر ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

مکتبۂ جامعہ اور حکومتِ جموں و کشمیر کے اشتراک سے

صدر دفتر
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

شاخ
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علیگڈھ

جون ۱۹۷۰ء

تعداد ۲۰۰۰

قیمت ۱/۹۰
لائبریری اڈیشن ۲/۳۰

لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی ۶

حرفِ آغاز

پرُانی کتابیں کم یاب ہوتی جا رہی ہیں ۔ جو کتابیں ملتی ہیں، اُن میں سے بیش تر قابلِ اعتبار نہیں ۔ عام طور سے اُن کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ جو اچھی کتابوں کو خریدنا چاہتے ہیں، قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے نہیں خرید پاتے ۔

اِن امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مکتبہ جامعہ نے، حکومتِ جموں وکشمیر کے تعاون سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں، صحتِ متن اور حسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی ۔ اِن کتابوں کا متن بہت اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے گا ۔ جو اُس کتاب کے معتبر ترین نسخے پر مبنی ہوگا ۔ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ صحتِ املا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا ۔ اور یہ ساری کتابیں آفسٹ پر نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی جائیں گی ۔ اس کے باوجود ان کتابوں کی قیمتیں کم سے کم ہوں گی اور اس کے لیے مکتبہ جامعہ، حکومتِ جموں وکشمیر کا ممنون ہے جس کی مالی امداد نے اِس بات کو ممکن بنایا ۔

ہمیں اُمید ہے کہ حکومتِ جموں وکشمیر کی مالی امداد سے مرتب کیا ہوا کتابوں کا یہ سلسلہ اُردو زبان وادب کے فروغ میں اور اچھی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت میں بے حد معاون ثابت ہوگا ۔

غلام ربانی تاباں

(جنرل منیجر)

تعارُف

مولانا محمد حسین آزاد اردو کے ان سدا بہار ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریروں کو خزاں کا اندیشہ کبھی نہیں ہو سکتا؛ ان کی تازگی ہمیشہ قائم رہے گی۔ آزاد کی اسی قسم کی ایک مختصر کتاب یہ نیرنگِ خیال ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا نام اس لحاظ سے اردو ادب اور صحافت میں ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اردو کا مشہور ہفت روزہ "دہلی اردو اخبار" انھیں نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا اور وہ مدتوں اس کے ایڈیٹر بھی رہے۔

محمد حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا مولوی محمد اکبر سے پائی اور تکمیل قدیم دلی کالج میں کی۔ جب شاعری کا شوق ہوا تو آزاد تخلص اختیار کیا اور اپنے کلام پر استادِ زمانہ شیخ محمد ابراہیم ذوق سے اصلاح لینے لگے، جو ان کے والد مولوی محمد باقر کے بچپن کے گہرے دوست اور ہم سبق تھے۔ ذوق کے انتقال (نومبر ۱۸۵۴ء) کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے مشورہ کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کا سیاسی ہنگامہ ہندستان کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ جب انگریزی اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا، تو حکام نے دیسی رعایا سے بہت وحشیانہ سلوک کیا۔ انھیں بد قسمتوں میں مولوی محمد باقر بھی تھے۔ وہ گرفتار کر لیے گئے اور چند دن بعد گولی کا نشانہ بنے۔

لامحالہ اب سارا خاندان حکومت کی نظر میں مشتبہ ہو گیا اور یہاں کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آزاد جان اور ناموس بچانے کی خاطر خاندان کو لے کر یہاں سے نکلے۔ ان لوگوں کو تو ایک دوست کے ہاں سونی پت چھوڑا، اور خود تلاش روزگار

میں روانہ ہو گئے۔ بالآخر پھرتے پھراتے ۱۸۶۱ء میں لاہور میں وارد ہوئے۔ اوّلاً ڈاک خانے میں ملازمت ملی اور پھر محکمۂ تعلیم میں پہنچے۔ لیکن ان کی اصلی فارغ البالی کا دور ۱۸۶۹ء میں شروع ہوا جب وہ عارضی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ۷۰ روپے ماہانہ پر عربی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اگلے ہی برس (۱۸۷۰ء میں) وہ اس جگہ مستقل کر دیے گئے۔ اب مشاہرہ ۱۵۰ روپیہ ہو گیا۔

۱۸۷۴ء میں آزاد نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کے بارِ احسان سے اردو زبان کبھی سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس سال اپریل میں انھوں نے محکمۂ تعلیم پنجاب کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ کیا جس میں انھوں نے شعرا کو مشورہ دیا کہ ہمیں قدیم رنگ کی گل و بلبل والی شاعری ترک کر کے خاص موضوعات پر نظمیں لکھنا چاہیے؛ اور مثال کے طور پر خود انھوں نے 'رات کے بیان میں' اپنی مثنوی پڑھی۔ اس کے بعد کوئی سال بھر تک مشاعرے ہوتے رہے، جن میں مصرعِ طرح کی جگہ نظم کے موضوع کا اعلان ہوتا تھا۔ مولانا حالی بھی ان میں سے چار مشاعروں میں شامل ہوئے تھے؛ ان کے لیے انھوں نے نظمیں بھی لکھی تھیں۔

آزاد کی دماغی حالت بہت دن سے مخدوش چلی آ رہی تھی، اب اس میں شدت آ گئی اور ان میں جنون کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس پر انھوں نے ۱۸۹۲ء میں پنشن لے لی۔ آخری ۲۰ سال اسی طرح اندھیرے اُجالے میں گزرے۔ کسی وقت ہوش میں آ جاتے، لیکن بیشتر وارفتگی کا عالم طاری رہتا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

نیرنگِ خیال میں جتنے مضمون شامل ہیں، یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چھ مضمون جانسن کے ہیں، تین ایڈیسن کے اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے۔ لیکن ان ترجموں میں آزاد نے اپنی ذہانت اور سحر بیانی سے اتنا ردوبدل کر دیا ہے کہ ان کا درجہ ترجمے سے بڑھ کر تخلیق کا ہو گیا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں کے قدیم ادب میں تمثیل کی صنف بہت مقبول رہی ہے۔ بالعموم اس سے مقصود پند و نصیحت ہوا کرتا تھا۔ اس رنگ کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اخلاقی صفات اور قوائے جسمانی کو مجسّم کر کے کہانی کے کردار و اشخاص کا درجہ دے دیا جاتا ہے، جن کے اقوال و افعال سے بعض سبق آموز اور نتیجہ خیز مثالیں وجود میں آجاتی ہیں۔ ایک تو جانسن اور اڈیسن اور دوسرے انگریز مصنفوں کے ابتدائی بلند خیالات، اس پر مترجم آزاد کا سا قادر الکلام مصنف اور انشار پرداز ــــ گویا سونے میں سہاگا ہو گیا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ مضامین اردو میں افسانے کے بھی سب سے اوّلیں نقوش ہیں۔

آزاد نے یہ مضمون ۱۸۷۵ء میں لکھنا شروع کیے تھے۔ ان میں سے بعض انجمن مفید عام قصور (ضلع لاہور) کے ماہانہ پرچے 'رسالہ' میں ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک کے متفرق شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ حصّہ اوّل کی شکل میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ جیسا کہ اس کے سرِ ورق پر 'حصّہ اوّل' کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں اور اس کا انھوں نے اس حصّے کے خاتمے پر بھی اعادہ کیا ہے، آزاد کا ارادہ حصّہ دوم بھی مرتّب کرنے کا تھا۔ افسوس کہ وہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے کہ اختلالِ دماغ کے عارضے میں مبتلا ہو گئے اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے صرف پانچ اور مضمونوں کے مسودے دستیاب ہوئے۔ ان کے پوتے آغا محمد طاہر نے انھیں اپنے دیباچے اور 'بقائے دوام' کے عنوان سے ایک طویل اختتامیے کے ساتھ مرتّب کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ ہم نے یہ دونوں حصّے اس مجلد میں یک جا کر دیے ہیں، آغا محمد طاہر کی دونوں تحریریں البتہ خارج کر دی گئی ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس طرح کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں

انسانی صفات اور عادات، اور فطرت کے مظاہر وغیرہ کو شخصیت کا جامہ دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ کسی افسانے کے کردار کی طرح بالکل اسی طرح کے کام کرتے ہیں اور سوچتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں، جیسی عام حالات میں کسی انسان سے توقع کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کے جو ایڈیشن مولانا محمد حسین آزاد کی زندگی میں شائع ہوئے، ان میں یہ التزام کیا گیا تھا کہ جہاں صفات کسی شخص یا کردار کی حیثیت سے مراد ہیں، وہ الفاظ جلی لکھے گئے تھے، تاکہ جہاں وہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ان سے امتیاز ہو جائے۔ اس ایڈیشن میں ایسے تمام الفاظ زیر خط کر دیے گئے ہیں۔

مالک رام

فہرست

تعارف از مالک رام

ـــــ حصّہ اوّل ـــــ

۱	بیان مافی الضمیر	۱۰
۲	دیباچہ	۱۱
۳	اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات	۱۷
۴	آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا	۲۸
۵	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	۳۸
۶	گلشنِ امید کی بہار	۴۵
۷	سیرِ زندگی	۵۴
۸	انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا	۶۴
۹	علوم کی بدنصیبی	۷۱
۱۰	علمیت اور ذکاوت کے مقابلے	۸۴
۱۱	شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار	۹۶
۱۲	ـــــ حصّہ دوم ـــــ	
۱۳	جنّت الحمقا	۱۱۷
۱۴	خوش طبعی	۱۲۸
۱۵	نکتہ چینی	۱۳۱
۱۶	مرقعِ خوش بیانی	۳۸
۱۷	سیرِ عدم	۱۴۶

بیان مافی الضمیر

اللہ اللہ! عجب عالم ہے۔ علوم و فنون کی فصل بہار پر ہے لیپل گریفن صاحب بہادر کشورِ پنجاب کے سکرٹرِ اعظم ہیں۔ کرنیل ہالرائڈ صاحب بہادر تعلیمِ پنجاب کے ڈائرکٹر ہیں۔ میں نے ڈائرکٹر صاحب کی قدردانی سے بہت کتابیں لکھیں کہ ہزاروں چھپ گئی ہیں اور ہندوستان کے گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر یہی پہلی کتاب ہے کہ اپنے دل کے ذوق سے لکھتا ہوں اور شوق سے چھپواتا ہوں۔ حضور سکرٹرِ اعظم اگرچہ ملکِ پنجاب کے سکرٹر ہیں! مگر ملکِ سخن کے بادشاہ ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ علوم و فنون علی العموم بچّوں کی طرح ان کی بدولت پرورش پاتے ہیں، مگر نظم و نثر کے اطفال روشنائیِ قلم سے اس طرح پلتے ہیں، جیسے بچے ماں کے دودھ سے۔

اے ملکِ سخن کے بادشاہ! خاک کی کیا بساط ہے؟ البتہ اونچے دامنوں میں لگ جاتی ہے، تو وہ بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خاک نہیں، غبارِ دامن کہلاتا ہے۔ فقیر آزاد اپنی کتاب کو دامنِ اقبال سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ اوراقِ پریشاں کچھ نہ تھے، اور کچھ نہیں ہیں۔ ہاں نامِ نامی سے منسوب ہوئے۔ اب سب کچھ ہیں۔ یا اللہ! اقبال کی روشنی میں یہ ذرّے، شہرت کے آسمان پر سورج ہو کر چمکیں۔

قطعہ

آزادِ با مراد، جو بندہ ہے آپ کا
ہے دل سے پاس گرچہ سلامی ہے دُور کا

ہے بے ہنر کہ باہنر، اچھا ہے یا برا
جو ہے سو ہے، مگر ہے دعا گو حضور کا

بندۂ آزاد محمد حسین

دہلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تماشا گاہِ عالم میں جو اہلِ نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال و مستقبل کی سیر دیکھ رہے ہیں، انھیں صاف نظر آتا ہے کہ ملک ہمارا عن قریب ایک آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے؛ نئے نئے علوم ہیں، نئے نئے فنون ہیں، سب کے حال نئے ہیں، دل کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں، رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقلِ رسا حیران ہے۔ مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تہذیب) کی سواریِ شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانہ کو جھاڑ بہار رہا ہے، اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔

جو نقشے کھنچ رہے ہیں اور جو بنیادیں پڑ رہی ہیں، اگرچہ ابھی تک کچھ اصل نہیں رکھتے لیکن جو نظرباز تجربے کی عینک سے دیکھ رہے ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی اور آبادیاں روے زمین پر چھا جائیں گی۔ وہ بنیادیں کیا ہیں؟ اور نقشوں سے کیا مراد ہے؟ ہاں، نقشے کتبِ علوم و فنون ہیں؛ بنیادیں تصانیفِ بوقلمون کہ جو کچھ سود و بہبود ہماری قسمت میں ہے، انھی پیمانوں اور اندازوں پر ہمیں ملے گا۔

اب تک اس ملک نے اپنی غریب حالت کے بموجب بہت سا سرمایہ تصنیف کا بہم پہنچایا۔ اور آج سے پچاس ساٹھ برس پیچھے ہٹ کر دیکھیں، تو ہمارے عام مطالب و اغراض بلکہ بات بات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علوم و فنونِ انگریزی جس طرح ہمارے لباس، مکانات، حالات، خیالات اور معلوماتِ سابقہ میں ترمیم کر رہے ہیں، اُسی طرح اُس کی انشا پردازی بھی ہماری انشا میں اصلاح دیتی جاتی ہے لیکن علمِ زبان

میں اس فرق کا امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں جنھیں اس کا مذاق ہے، وہی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں جو کچھ اردو کا رنگ نکلا تھا، سبزۂ خودرو کی طرح نکلا تھا۔ خاص و عام کے دلوں کی اُمنگ تھی۔ جدھر جھک گئے اُدھر جھک گئے۔ خاص شخص کی یا خاص اصول کی کوشش نہیں ہوئی۔ اور اب تک یہ حال ہے کہ تاریخ فروعِ ریاضی وغیرہ اکثر علوم کی کتابیں ترجمہ اور تصنیف ہوئیں، مگر فنِ انشا کی طرف کسی نے خیال نہیں کیا۔ زبانِ اردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اردوے شاہ جہانی میں پھرتا ہوا ملا۔ کسی کو اس غریب کے حال کی پروا نہ ہوئی۔ اتفاقاً شعرا نے اٹھا لیا اور محبت سے پالنا شروع کیا۔ اس نے اُنھی کے کھانے سے خوراک پائی، اُنھی کے لباس سے پوشاک پہنی، اُنھی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا۔ اسی واسطے انھی کی زبان سے بولنا سیکھا، اُنھی کے قدموں پر چلنا سیکھا، اُنھی کے خیالات اس کے دل و دماغ میں سمائے۔ حالت اس کی یہ رہی کہ علما تو درکنار، ادنیٰ ادنیٰ آدمی اردو میں لکھنا ہتک سمجھتے تھے۔ جب ۱۸۳۵ء میں اس نے دفاترِ سرکاری میں دخل پایا، ساتھ ہی اخباروں پر قبضہ ہو گیا، تب لوگوں کی نظروں میں عزت و وقار ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر قابض ہو گیا۔

غرض کہ زبانِ اردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے، وہ شعراے ہند کی کمائی ہے، جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دُکان سجائی ہے۔ یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لیے تہی دست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ عام مطالب ادا کرنے میں بھی مفلس ہے۔ چنانچہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگزشت اس زبان میں لکھیں، تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہے، وہ نہیں نکل سکتا۔ اسی واسطے اس کا اثر بھی جیسا کہ جی چاہتا ہے، پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا۔ بات یہ ہے کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے، وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی۔ وہاں سے جو گری، تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی۔

اس کی طبع آزمائی کا زور اب فقط چند مطالب میں محصور ہے۔ مضامینِ عاشقانہ، گلگشتِ مستانہ، نصیبوں کا رونا، امیدِ موہوم پر خوش ہونا، امرا کی ثنا خوانی، جس پر خفا ہوئے، اس کی خاک اڑائی۔ البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجہ تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اور اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اس کے پاس ہے۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں، جن کے خیالات باریکی اور زناکیِ عبارات میں جگنو سے اڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو، تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اردو نے پرورش پائی، تو اس کا کیا حال ہو گا۔ اے اہلِ وطن! آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوانِ شاہانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لے کر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمھیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنیٰ درجہ پر ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں۔ ہاں، اس کا بڑھنا تمھارے ہاتھ میں ہے۔

زبانِ انگریزی بھی مضامینِ عاشقانہ، قصہ و افسانہ اور مضامینِ خیالی سے مالامال ہے، مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔ اُس کا اصل اُصول یہ ہے کہ جو سرگزشت بیان کرے، اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے، اور نشتر اُس کا دل پر کھٹکے۔ اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر سجتے ہوں، نہ کہ شاخ و شجر سب غائب ہو جائیں، فقط پتوں کا ڈھیر رہ جائے۔ بیشک فنِ انشا اور لطفِ زبان تفریحِ طبع کا سامان ہے۔ لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے اسے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے، انگریزی میں ایسا نہیں ہے۔ اہلِ فرنگ نے جس طرح ہر امر کی بنیاد ایک منفعت پر رکھی ہے، اسی طرح اس میں بھی موقع موقع سے مختلف منافع مدِ نظر رکھے ہیں۔ زبانِ انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ اور ہی ہے، مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعتِ خیال اور پردازِ فکر اور تازگیِ مضامین اور طرزِ بیان کا انداز قابل دیکھنے

کے ہے۔ یں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں اُن مطالب پر مشتمل ہیں جنھیں یہاں (راستے) جواب مضمون کہتے ہیں۔ ان میں انواع واقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں۔ مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں، جن کی روشنی ابھی ہمارے دل ودماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے، اور ان کے معاملات اور ترقی وتنزل کو سرگزشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفتِ پسندیدہ پر رغبت اور کسی خُلقِ بد سے نفرت ہو، یا کسی حصولِ مطلب کے رستے میں جو نشیب وفراز آتے ہیں، ان سے واقف ہو۔ اگرچہ ان میں طرزِ بیان کا طور وہ نہیں جو ہم اُردو فارسی میں پڑھتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اُردو پر قادر ہو، تو انھیں پڑھے اور ان کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرۂ حال کو ایسے خط وخال سے آراستہ کرے کہ خاص وعام کی نظروں میں کُھب جائے۔

البتہ ایسی قدرت حاصل ہونی مشکل ہے اور مشکل تر یہ ہے کہ انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسومِ قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جُز ہیں۔ رومی ویونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشمِ سخن ہر بات میں اُن کے قصّوں پر اشارے کرتی جائے۔ مگر اُردو کے باغ نے فارسی وعربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں، اور یہ سخت دشواری ہے کیونکہ اگر لکھنے میں کچھ تصرف کریں، تو ترجمہ نہ رہا۔ اور اصل کی رعایت کی، تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی، نہ کہ رفیقِ تفریح۔

حق یہ ہے کہ مجھ ناقابل کو ایسے موقع پر قلم اٹھانا، ان مضامین کو ذبح کرنا

ہے۔ لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی، طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں، یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔ علوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہییں، جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہماری بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں سب نظر آئیں اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو، بے جان مورتوں میں جان پڑنے کی ساعت آ گئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جان بخشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں ہے کہ زبان کے کپڑے اتار کر ننگا منگا کر دو، استعارہ اور تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں، ایسے کپڑے پہناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کر دیں، نہ کہ اندھیرا چھا جائے۔ کیونکہ اور زبانوں میں کیا ہے، جو ہماری زبان میں نہیں ہاں طرز بیان کا ایک ڈھب ہے، وہ تقریر میں آ جانا چاہیے۔ فقط اتنی ہی کمی ہے۔

اے جواہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبانِ انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اُردو کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ ہوں، اس لیے یہاں بھی درماندہ ہوں۔ پھر بھی بلہوسی دیکھو کہ شہ سواروں کے ساتھ دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ جتنا نالائق ہوں، اُتنا ہی زیادہ شائق ہوں۔ دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانعِ مذکور کے جو لطف طبیعت کو بعض مضامینِ انگریزی سے حاصل ہوا، نہ چاہا کہ اپنے پیارے اہلِ وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔ جس قدر ہو سکے اور جس طرح ہو سکے، ایک پرتو اُردو میں دکھانا چاہیے۔ بالفرض مجھ سے بیان کا حق نہ ادا ہو گا، ایک رستہ تو نکل آئے گا۔ زبان کے اہلِ ذوق بڑے بڑے صاحبِ قدرت اور ہوں گے، کوئی نہ کوئی منزلِ مقصود تک پہنچے گا۔

یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں، جو کچھ کانوں نے

سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔ اکثر نازک دماغ تو کہہ دیں گے کہ واہیات ہے۔ بہت کہیں گے، کوئی کہانی کہی ہے، مگر مزا نہیں۔ جو بڑے مبصر ہیں، وہ کہیں گے کہ ہے، مگر غور طلب ہے۔ بیشک، یہ کہنا ان کا اصلیت سے خالی نہیں کیونکہ خیالی تصویریں حکمت و اخلاق کی ہیں۔ فکر کے قلم نے خاکہ ڈالا ہے اور استعارہ تشبیہ نے رنگ دیا ہے۔ طبیعتیں رستہ سے آشنا نہیں سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔ خیر آزاد! ناامید نہ ہونا چاہیے:

تمھاری سینہ نگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب، تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہارِ مطلب کا وسیلہ ہی کہیں، تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچۂ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں، وہی اس سے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اِس کا مرتبہ اُن لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیار کر دے جو کسی توپ سے نہ ٹوٹ سکے؛ اور چاہے تو ایک بات میں اسے خاک میں ملا دے جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے، اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے، اُن سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصّع کار ہے کہ جس کی دست کاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نولکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اس کی قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیّار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے کہ نظر کے میدان میں مرقّع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اسے پھول، گل، طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔ اس نادر دست کار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح مُوقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر آتی ہیں۔ لیکن اِس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چُہچہا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بُوند پانی اُس میں ڈالے، ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی، کبھی گلنار، کبھی آتشی، کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ۔ اور پھر سر تا پا عالمِ نیرنگ۔

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں اس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گزر گئے ہیں جن کے مرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا اُن کے قلم گھس گئے ہیں، اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہوگئی ہیں، جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سُن کر کہتی ہیں کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بے جا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے، تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونو صفتیں ہیں، مگر ناتمام ہیں۔ اور اس کے سبب ظاہر ہیں۔

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے، اِس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو، کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اس کی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام اُردو خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں، بازار کی زبان ہوں؛ اٹھنے بیٹھنے، لین دین کی باتوں کے لیے کام میں آتی ہوں۔ سلاطینِ چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہ جہان کے گھر پیدا ہو، اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے، تو انھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ اُن کی فرمایش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں، تصنیف ہوئیں اور اُنہی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی۔ ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی

سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں، اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل ۲۰۰ برس کی ہو، اس کی بساط کیا؟ اور اُس کے الفاظ کے ذخیرہ کی کائنات کیا؟ پس اس وقت ہمیں اس کی کمیِ الفاظ سے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحبِ سرمایہ کہنا بے جا ہے۔ ہر زبان اہلِ زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں، بالکل بے جا ہے۔

عربی زبان بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو، اس میں سارے لفظ تو عربی نہیں؛ صدہا رومی، صدہا یونانی، صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ۔ اور زبانِ فارسی کا تو ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے، مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آ رہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہلِ ملک میں علم آتا ہے، پھر علمی اشیا کے لیے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا ہے، نہ کوئی صاحبِ علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا ہے۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں، ویسے ہی ان کے الفاظ پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

اول خاص و عام میں علم پھیلتا ہے، ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا انجن اور اس کے کارخانہ کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادنیٰ ادنیٰ ناخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے یا پہلے یاد کرواتے، تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اِسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا، خواہ اس کا یہی نام لیں،

خواہ فانوسِ جادو کہیں، خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں، ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر وہ مشاہدہ میں عام ہو جائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے، تو اُلٹے سے اُلٹا اس کا نام رکھ دیں، وہی بچّہ بچّہ کی زبان پر مشہور رہ جائے گا اور وہی سب سمجھیں گے۔ انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں، مثلاً ٹیلی گراف یا الیکٹریسٹی وغیرہ، ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصلی معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔ مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں، اس لیے الفاظِ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے، تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے تو اہلِ ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود علوم و فنون حاصل کرو، اپنے ملک میں پھیلاؤ، اور بھائی بندوں کو اس سے آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہوں گے، تو اُن کے الفاظ بھی ہوں گے؛ ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا۔

تمہاری انشا پردازی پر جو نقص کا الزام ہے، وہ بھی کچھ درست ہے اور کچھ قابلِ چشم پوشی کے ہے۔ یہ تو ابھی بیان ہوا کہ زبانِ مذکور علمی زبان نہیں۔ سو برس ہوئے کہ ہندوستان کے رنگین مزاجوں نے فقط اس حُبّ الوطنی سے کہ ہماری زبان بھی اور زبانوں کی طرح نظم سے خالی نہ ہو، اس میں اپنی مرصّع کاری اور نقش نگاری دکھانی شروع کی۔ اور حق یہ ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جو کچھ زور اس نے پایا، انہی کی بدولت پایا۔ انشا پردازی کا قاعدہ ہے کہ ابتدا میں جو مطالب کسی زبان میں ادا ہوتے ہیں، تو اُن میں سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب قریب کے استعارے خرچ ہوتے ہیں۔ اسی واسطے جو مطالب اس میں ادا کیے جاتے ہیں، وہ سنتے ہی سمجھ میں آجاتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس پاس کے استعارے اور اُن چیزوں کی تشبیہیں جو آنکھوں کے سامنے ہمارے

آس پاس موجود ہیں، وہ فقط مطلبِ مذکور کو سمجھاتے ہی نہیں، بلکہ اپنی رنگینی اور لطافت سے اُس کے لطف کو روشن کر کے دکھاتے ہیں؛ اور چوں کہ سادگی اور آسانی کے سبب سے اُنھیں سب سمجھتے ہیں، اس لیے سب کے دل اُس کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد قریب قریب کی تشبیہیں اور استعارے تو خرچ ہو جاتے ہیں اور آس پاس کی تشبیہیں عام تام ہو کر تمام ہو جاتی ہیں۔ نئی نسلیں دستمال تشبیہوں اور استعاروں کو برتنا، چبائے ہوئے نوالہ کا چبانا سمجھتی ہیں۔ لیکن علم اور مشق جو مختلف رستوں سے آگاہ کر دیتے ہیں، اس لیے ان کے فکر کبھی دائیں بائیں پھیلتے ہیں، اور کبھی بلند ہونا شروع کرتے ہیں اور دُور دُور ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ فارسی اور اردو زبان میں جو کیفیت اِس کی گزری ہے، اس وقت میں اُسی کا اشارہ کرتا ہوں کہ شعرا نے مستعمل استعاروں سے بچنے کے لیے استعارہ اور استعارہ در استعارہ نکالا اور اسے ایک ایجادِ دلپذیر تصوّر کر کے "نازک خیالی" نام رکھا۔ چونکہ دنیا میں ہر ایک نئی چیز بہت مزا دیتی ہے، اس لیے اوروں نے بھی اسے پسند کیا اور علم کی مشکل پسندی نے اسے زیادہ قوت دی اور یہ معاملہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ ان بلند خیالوں میں دنیا کے کاروبار مثلاً خط و کتابت یا تاریخی مقاصد یا علمی مطالب کا ادا کرنا تو بہت دشوار تھا، مگر ایک فرقہ پیدا ہوا جنھوں نے "خیال بند" کا خطاب حاصل کیا۔ انہی کی نثریں پنج رقعہ، مینا بازار، چار عنصر وغیرہ اور نظم میں جلال اسیر، قاسم مشہدی، بیدل، ناصر علی اور ان کے مقلدوں کے دیوان موجود ہیں۔ چنانچہ دونوں کے امتیاز کے لیے دو شعر بھی اس مقام پر لکھتا ہوں۔ پہلے طریقہ میں ایک استاد کہتا ہے:

سحر خورشید لرزاں بر سرِ کوے تو مے آید
دل آیینہ را نازم کہ بر روے تو مے آید

دیکھو ناصر علی سرہندی نے اسی مضمون کو اپنی نازک خیالی کے زور سے الگ کیا ہے۔

بنازد چشم بیدل تابِ حسنِ بیحجابش را
کہ باشد صافیِ آیینہ شبنم آفتابش را

چونکہ اُردو نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی تھی، اس لیے چند روز کے بعد یہی دقت اسے بھی پیش آئی۔ میر سوز، میر تقی، سودا، جرأت وغیرہ کے زمانے تھے۔ ان میں اگرچہ مضامین شاعرانہ تھے، مگر زبان میں ابتدائی خوبی موجود تھی۔ بعد اُن کے وہی استعاروں کے اینچ پیچ اور خیالوں کی معمولی ترقی شروع ہوئی۔ البتہ خال خال آدمی ایسے رہے، جو بزرگوں کی تقلید سے صفائی اور سادگی کی لکیر پر فقیر رہے۔ مثلاً قدما میں خواجہ میر درد کہتے ہیں:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

متاخرین میں غالبِ نازک خیال اس سے الگ ہو کر کہتے ہیں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ جو کچھ لطافت یا زور ہماری زبان میں پیدا ہوا، انہیں شعرا کی برکت سے ہوا۔ مگر وہ عاشقانہ مضامین کے ادا کرنے کے سامان اور تغزل کے خوشنما انداز، اور اُس کے الفاظ اور ترکیبوں کی دلآویز تراشیں تھیں۔ بھلا خیالاتِ فلسفہ کے سامان، علوم کی اصطلاحیں، مختلف مضامینِ تاریخی کے ادا کی طاقت، دلائل و براہین کے لڑانے کے زور اس میں کہاں سے آتے۔ اگرچہ ابتدا میں جو کچھ تھا، یہ رنگ بہت خوشنما تھا۔ مگر اب دیکھتا ہوں، تو زمانے کے انداز نے اُسے بھی پھیکا کر دیا ہے، اور تمہاری انشا پردازی کا یہ حال ہو لیا ہے کہ غیر تو میں تو کچھ کہیں بجا ہے، میں خود دیکھتا ہوں اور شرماتا ہوں۔ کیونکہ مستعمل چیز میں شگفتگی اور تازگی دکھانی بہت مشکل ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ایک خزانہ مصوری کا تمہارے ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی

قفلوں میں بند ہے۔ جس کی کنجی انگریزی زبان ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ہم فارسی، عربی کے الفاظ اُردو میں بولتے ہیں، اسی طرح انگریزی الفاظ بولنے لگیں، یا ان کے محاوروں اور اصطلاحوں کے ترجمے اُردو میں استعمال کرنے لگیں۔ لیکن تم خیال کرو کہ عبارت اور الفاظ حقیقت میں انسان کے خیالات اور مقاصد کے لباس ہیں، اور چوں کہ طبعی خیال فرقہ ہائے انسان کے ہمیشہ قریب قریب ہوتے ہیں، اس لیے وہ جس ملک میں جا ہیں، رنگِ ظہور دکھائیں۔ اصلیت میں کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہی ہوں گے، بلکہ اُن میں بعض ڈھنگ ایسے ہوں گے کہ ذرا رنگ پلٹ کر جا ہیں گے، تو دوسری طرف آجائیں گے اور نئی بہار دکھائیں گے۔ چنانچہ جب بنظرِ غور دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ دو قوموں کے ارتباط سے ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے پرتو لیتی رہی ہے۔ دیکھ لو، بھا شا پر جب فارسی عربی آکر گری، تو اُس کا کیا اثر ہوا اور اب انگریزی کیا اندرونی اثر کر رہی ہے۔ فارسی اُردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمرِ رواں یا آبِ گزران کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہ

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصّہ کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہمچو مارِ سیاہ برخود پیچید اور کبھی جوشِ غضب کے لیے کہتے ہیں کہ آتش از چشمش پرید، دُود از نہادش بر آمد، اور ہمچو سپند از جا بر جست۔ پس انگریزی میں متھالیجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسّم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے اور انہی سامانوں سے سجایا ہے، جو اُن کے لیے لازم اور شایان ہیں۔ چنانچہ

وقت

ایک پیرِ کہن سال کی تصویر ہے۔ اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پرِ پرواز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشۂ ساعت ہے کہ جس سے اہلِ عالم کو اپنے گزرنے کا اندازہ دکھاتا ہے۔ اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشتِ امید یا رشتۂ عمر کو کاٹتا جاتا ہے۔ یا ظالم خونریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں اُسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں۔ لیکن اور دن کے چوٹیاں پیچھے ہوتی ہیں، اُس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گذر گیا، وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ہاں جو پیش بین ہیں، وہ پہلے ہی سے روک لے، سو روک لے۔

غصہ

ایک عورت ہے، کالا رنگ، ڈراؤنی صورت۔ تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں، اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

بعض صورتوں میں اُس کے دو پر ہیں کہ اڑائے لیے جاتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ میں شعلۂ آتش ہے کہ دم بدم بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ اور ایک ہاتھ میں خونریزی کا برچھا ہے۔

عشق

ایک موقع پر اُسے نوجوان، خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی بُرائی کو نہیں سوچتا۔ کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی

کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے، مار بیٹھتا ہے، اس کی پناہ نہیں۔

ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لٹکتا ہے، اور ہاتھ سے تیر کا پیکان تیز کر رہا ہے۔ یہ تصویر ایک ہیرے پر کھدی ہوئی ہاتھ آئی تھی۔ خدا جانے کس عہد میں کھدی ہوگی اور کیا طلسم اس میں باندھا ہوگا!

افواہ یا شہرت

اِس کی تصویر دیکھی۔ ایک بُڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے مُنہ میں زبان ہلتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے، وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے۔

حُسن کی پری

سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔ شاید اس سے جوش و خروش کے ساتھ اس کی لطافت اور نزاکت کا اشارہ ہو۔ وہ خود بھی محبت رکھتی ہے، مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے۔ جس کو وہ نصیب ہو جائے، وہ اس کے پرتوِ جمال سے کامیاب ہو، پھولوں میں مہندی، گلاب، سیب، لالہ، نافرمان وغیرہ سے اس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے۔ فاختہ، ہنس، ابابیل، ہُدہُد وغیرہ اُس کے تخت کو اُڑاتے ہیں۔ خوشبوؤں کی دھونی اور پھولوں کا ہار اس کا متبرک چڑھاوا ہے۔ انگریزی میں انھیں گاڈز کہتے ہیں اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ کے لیے مختلف گاڈز نبار کیے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹادیا اس لیے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیاء کے لیے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع و بدائع پر نظر کریں، تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کون سا صانع ہوگا جو ایسی دست کاری کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالمِ موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے، تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لیے ایک ایک ربّ النوع فرض کیا جائے، جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو اور سب کا مالک ربّ الارباب جامع جمیع صفاتِ کمال۔ اہلِ شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک فرشتۂ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صرف زبان کا فرق ہے، ورنہ وہی دیبی یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی ربّ النوع، وہی فرشتۂ مؤکل۔ یہ خیال مدت سے دل میں کھٹکتا تھا۔ چند روز ہوئے کہ شاہِ ایران نے جو سفرنامہ یورپ کا آپ لکھا ہے، وہ میری نظر سے گزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغِ رنگین میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے اور اس پر بہار کی گاڈس سجائی ہے۔ چنانچہ شاہ نے وہاں پہنچ کر اُسے دیکھا ہے اور اپنے بیان میں اُسے ربّ النوع ہی لکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر ہے جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کیے ہیں، مگر سب کا راستہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبۂ موہوم کو مجسم فرض کرتے ہیں اور اس کی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری پوری قائم ہوتی ہے، اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں، ٹھیک درستی کے ساتھ ہوتے ہیں اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی انشا پردازی کا ایمان ہے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے، تو ہمیں چاہیے کہ انگریزی باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں۔ البتہ دونوں زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہیے کہ یہ

تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو سکے، جیسا کہ ابتدا میں ہمارے اُردو، فارسی کے انشا پرداز کر گئے!۔ اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہوگا، ان انگریزی دانوں سے ہوگا، جو دونو زبانوں میں پوری پوری مہارت رکھتے ہوں گے، کیونکہ ان کے دو آنکھیں روشن ہیں۔ اُردو اپنی زبان ہے اور انگریزی کنجی خدا نے دی۔ ہم اور ہمارے ساتھی پرانی لیکروں کے فقیر، جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے۔ نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے چقماق کے دونو جُزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اُون اور شیشے کو رگڑو کہ الیکٹرسٹی کے فوائد حاصل ہوں۔ لیکن فقط پتھر ہو، تو پتھر ہی ہے اور فقط شیشہ، ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندوستانی کہیں سودا اور میرؔ کے زمانے نے عمر دوبارہ پائی۔ اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کر دو کہ انگریز کہیں: ہندوستان میں شکسپیر کی روح نے ظہور کیا۔

آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا

اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا

سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دور بین لگانے والے ماضی و استقبال کے، روایت کرتے ہیں کہ جب زمانہ کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا، اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بے فکریِ مدام کے عالم میں بسر کرتے تھے۔ ملک ملکِ فراغ تھا، اور خسرو ارام رحم دل فرشتہ مقام گویا اُن کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس میں ہوا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے، ہری ہری سبزہ کی کیاریوں میں لوٹتے تھے، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہ خانے سجانے پڑتے، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرنے، قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی ہو یا ہوا کی گرمی، معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چشمے پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزا اور دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ بیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب و ہوا قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چُن دیتی تھیں، وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی

خوشبویوں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے، خوبصورت خوبصورت چرند، پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جا بجا درختوں کے جھرمٹ تھے، انہی کے سایہ میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا، سب کی طبیعتیں خوشی سے مالامال اور دل فارغ البال تھے۔

دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے۔

اتفاقاً ایک میدانِ وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا، مگر بُو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں، اور ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے میرے ہی کام آئے، اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آکر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا اُن کی ذُریات یعنی غارت، تاراج، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگی۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے، تو رفتہ رفتہ غرور، خود پسندی، حسد نے اس باغ میں آکر قیام کر دیا۔ اُن کے اثرِ صحبت سے لوگ بہت خراب ہوئے کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کے کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے یعنی عیشِ وافر اور سامانِ فراواں جو کچھ درکار ہو، موجود تھا۔ اور اسی بے احتاجی کو لوگ تونگری کہتے تھے۔ پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو، اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو، لیکن تونگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اُس بے چارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو۔ مگر انھیں جب ہمسایے خوشحال نظر

آتے تھے، تو جل جاتے تھے اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے۔

جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے، وہاں احتیاج و افلاس
نہ ہو تو کیا ہو۔

اس بدنیتی کی سزا یہ ہوئی کہ احتیاج اور افلاس نے بزرگانہ لباس پہنا اور ایک پیرزادے بن کر آئے۔ حضرتِ انسان کہ طمعِ خام کے خمیر تھے، خسرو آرام کی عقیدت کو چھوڑ کر ان کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ سب اُن کے مرید اور معتقد ہو گئے، اور ہر شخص اپنے تئیں حاجت مند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ اس بدنیت نحس قدم کے آنے سے ملکِ فراغ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا، سال میں چار موسم ہو گئے، زمین بنجر ہو گئی، میوے کم ہونے لگے، ساگ پات اور موٹی قسم کے نباتات پر گزران ٹھہری۔ خزاں کے موسم میں کچھ بُرے بھلے اناج بھی پیدا ہونے لگے، لیکن جاڑے نے بالکل لاچار کر دیا، کبھی کبھی قحط سالی کا ٹڈی دل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں وبا اور امراض غول کے غول بیماریاں اپنے ساتھ لے کر آتے اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تہلکہ پڑا کہ اگر ملکِ فراغ کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی، تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دُکھ تو سہہ سکتے تھے، مگر قحط کی مصیبت غضب تھی۔ چوں کہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں، اس لیے سب اپنے کیے پر پچھتائے۔

اب پچھتانے سے کیا حاصل ہے؟ ہاں ہمت کرو اور محنت پر کمر باندھو۔

عالم کا رنگ بے رنگ دیکھ کر تدبیر اور مشورہ دو تجربہ کار دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور ایک سیب کے درخت میں جھولا ڈالے الگ باغ میں جھولا کرتے تھے، البتہ جو صاحبِ ضرورت اُن کے پاس جاتا، اُسے صلاح مناسب بتا دیا کرتے تھے۔ یہ سب مل کر اُن کے پاس گئے کہ برائے خدا کوئی ایسی راہ نکالیے جس سے احتیاج و افلاس کی بلا سے بندگانِ خدا

کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اپنے کیے کا علاج نہیں۔ خسروِ آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا۔ تم نے اس کا حقِ شکر نہ ادا کیا، اور اس آفت کو اپنے ہاتوں سر پر لیا۔ یہ افلاس ایسی بُری بلا ہے کہ انسان کو بے کس اور بے بس کر دیتی ہے۔ مانگے تانگے کے سوا خود اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو، اسی نے ملکِ فراغ کو کیسا تباہ کر دیا ہے کہ دلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر یہ کہ ہم نے سُنا ہے 'احتیاج' دا فلاس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے، کیونکہ اُس نے امید کا دودھ پیا ہے ہنرمندی نے اسے پالا ہے۔ کمال کا شاگرد ہے۔ ہو سکے تو جاکر اس کی خدمت کرو۔ اگرچہ اُسی کا فرزند ہے، لیکن اوّل تو سلطنت کا مقدمہ درمیان ہے۔ دوسرے، ماں کے دودھ کا زور اس کے بازوؤں میں ہے۔ استاد کی پھرتی اور چالاکی طبیعت میں ہے۔ شاید کچھ کر گزرے۔ تدبیر اور مشورہ کا سب نے شکریہ ادا کیا اور سیدھے محنت پسند خردمند کے سراغ پر آئے۔ دامنِ کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان قوی ہیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہوا سے نِکھرا ہوا، دھوپ سے تمتمایا ہوا، مشقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا، پسلیاں اُبھری ہوئی؛ ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان، ایک ہاتھ میں معماری کے اوزار لیے ہانپ رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک بُرج کی عمارت کی بنیاد ڈالی ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا، اور ساری داستان اپنی مصیبت کی سنائی[1]۔

وہ انہیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک قہقہہ مار کر پکارا کہ آؤ انسانو، نادانو! آرام کے بندو! عیش کے پابندو! آؤ آؤ، آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمہاری خوشی کی امید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے، تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسروِ آرام ایک کمزور، کام چور،

---

[1] اس عمارت سے گویا وہی کاروبار مراد ہیں۔ انہی میں آیندہ یہ لوگ گزران کرکے اپنی قسمت کا لکھا پورا کریں گے۔

بے ہمت، کم حوصلہ، بھولا بھالا، سب کے مُنہ کا نوالہ تھا۔ نہ تمھیں سنبھال سکا، نہ مصیبت سے نکال سکا۔ بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلا بھی نہ ٹال سکا۔ پہلے ہی حملے میں تمھیں چھوڑ دیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ہاتھ سے کھویا اور تم کو منجدھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو۔ ہماری آواز پر آیا کرو۔ ہم تمھیں ایسی ایسی تدبیریں سکھائیں گے کہ جس سے یہ شوریت زمین کی دور ہو جائے گی۔ ہوا کی شدّت اعتدال پائے گی۔ گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئے گی۔ ہم تمھارے لیے پانی سے مچھلیاں، ہوا سے پرندے، جنگل سے چرندے نکالیں گے۔ زمین کا پیٹ چاک کر ڈالیں گے اور پہاڑوں کی انتڑیاں تک نکالیں گے۔ ایسے ایسے دھات اور جواہرات دیں گے کہ تمھارے خزانوں کے لیے دولت ہو، ہاتھوں میں طاقت ہو، اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کروگے اور ان کے آزاروں سے محفوظ رہوگے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالو گے۔ پہاڑ کے پہاڑ اکھاڑ دو گے۔ تم دیکھنا، میں زمانہ کو وابستۂ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر کر لوں گا۔ غرض ان باتوں سے سب کے دلوں کو لبھا لیا۔ وہ بھی سمجھے کہ محنت پسند خردمند بنی آدم کا خیر خواہ ہمارا دلی دوست ہے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ، اس کے پاؤں پر گرے۔ ہمت اور تحمل اس کے پہلو میں کھڑے تھے اسی وقت انھیں جماعت مذکور پر افسر کر دیا۔

اے حضرتِ انسان! قدرتی گلزاروں کی بہار تو دیکھ چکے اب اپنی دستکاریوں کی گل کاری دیکھو۔

الغرض ہمت اور تحمل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا کھودنا، اتار چڑھاؤ ہموار کرنا، تالابوں سے پانی سینچنا، دریاؤں کی دھاروں کا رخ پھیرنا، سب سکھایا۔ لوگوں کے دلوں پر اُس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعتہً کمریں باندھ، آنکھیں بند کر، دیمک کی طرح روئے زمین کو لپٹ گئے۔

عالم صورت چند روز میں رنگ نکال لایا۔ گر نئے ڈھنگ سے یعنی ساری زمین شہر قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میووں سے مالا مال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے، عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، گھر آباد ہو گئے۔ جدھر دیکھو ڈالیوں اور رہگزاریوں میں میوے دھرے، دسترخوان گھروں میں سجے، ذخیرے غلوں سے بھرے؛ کیا گھر، کیا باہر، اس کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ غرض محنت پسند خردمند نے اس فرمانبردار رعیت کی بدولت یہ کامیابیاں اور فتوحات نمایاں حاصل کر کے سلطان محنت پسند کا لقب حاصل کیا اور جا بجا ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت جمائی۔

اے محنت کشو! محنت کی بھی ایک مدت ہے۔ آخر ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے۔

سلطان محنت پسند اپنے ملک میں ہمیشہ دورہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاقاً اس کی سواری ایک کوہستان میں گزری، وہاں میووں کی بہتات، پانی کے چشمے جیسے آبِ حیات، ہرے ہرے سبزے، درختوں کے سایے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، خوبصورت خوبصورت جانور کلیل کر رہے تھے۔ یہ جگہ بہت بھائی۔ چاہا کہ کوئی دم ٹھہرے اور دم لے۔ اتفاقاً وہاں ایسی ایک قوم سے سامنا ہو گیا، جن کی کثرت و انبوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، مگر سب کے سب ضعف و ناطاقتی سے زمین میں نچے جاتے تھے۔ ان میں تھکن اور سستی کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اور ناتوانی ان پر سردار تھی۔ صورت اس کی یہ کہ آنکھیں بیٹھی ہوئی، چہرہ مرجھایا ہوا، رنگ زرد، منہ پر جھریاں پڑی، کمر جھکی، گوشت بدن کا خشک، ہڈیاں نکلی ہوئی۔ غرض دیکھا کہ سب ہانپتے کانپتے، روتے بسورتے، آہ آہ کرتے، چلے آتے ہیں، ان کی آوازیں ہی سن سن کر لوگوں کے دل مردہ اور جی افسردہ ہوئے جاتے تھے۔

تحمل اور ہمت کو جوں ہی ان کی صورت نظر آئی، دفعتہً غش کھا کر گر پڑے۔ اس جنگل کی ہوا میں عجیب تاثیر تھی کہ بھلے چنگے آدمیوں کے جی چھوٹ جاتے تھے اور حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سب کے ہتیار اور اوزار ہاتھوں سے چھوٹ پڑے۔ بہتیرا دلوں

سنبھالتے تھے، مگر دل قابو میں نہ آتے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر سب کی عقلیں جاتی رہیں اور پھر نئے سرے سے اپنے حال پر افسوس کرنے لگے کہ ملکِ فراغ کو کیوں چھوڑا اور خسروِ آرام کی اطاعت سے کیوں منہ موڑا۔ آپس میں صلاح کی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر مصلحت یہ ٹھہری کہ چلو پھر اپنے قدیمی بادشاہ خسروِ آرام کی خدمت میں چل کر سلام کرو اور باقی زندگی جس طرح ہو، اس کی اطاعت میں بسر کردو۔

جو آسایش کے قدرتی سامان تھے، وہ اپنے ہاتھوں کھوئے اب محنت کے بنائے ہوئے سامانوں سے آرام چاہتے ہو۔ نہ ہوگا! نہ ہوگا!

خسروِ آرام بھی دنیا کے پردے سے اٹھ نہ گیا تھا۔ ایک پل میں اس کے پاس جا پہنچے عذرِ تقصیر میں عرض کیا کہ جو کچھ ہم نے محنت کی مدد سے حاصل کیا ہے، وہ سب نذر ہے ہمیں حضور اطاعت میں قبول فرمائیں۔ یہاں خسروِ آرام نے بھی اب دربار کا آئین کچھ اور کر دیا تھا۔ تکلف، آرایش، بناؤ سنگار، عیش، آرام بہت سے لوگ رکنِ دربار ہو گئے تھے۔ قدرتی سبزہ زار اور خدائی مرغزاروں کو چھوڑ کر محلوں میں جا بیٹھا تھا۔ بالا خانوں اور دیوان خانوں میں رہتا تھا۔ خانہ باغوں کی روشوں پر گلگشت کرتا تھا۔ جاڑوں میں نرم نرم بستروں اور گرم گرم مکانوں میں سوتا تھا۔ گرمیوں میں تکلف کے تہ خانوں میں بیٹھتا، اور بناوٹ کے فوارے سامنے چھٹا کرتے۔ باوجود اس کے کوئی نعمت مزا نہ دیتی تھی، اور کوئی غذا انگ نہ لگتی تھی۔ سب کچھ موجود تھا مگر خاطر خواہ خوشی ایک بات سے بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ غرض ملکِ فراغ میں جو اس کے انتظام اور آزادی کا لطف تھا، وہ نہ رہا تھا کیوں کہ سلطان محنت پسند کے زیرِ حکم رہ کر لوگ خالی بیٹھنے سے بھی گھبراتے تھے؛ اور جسے خوشحالی اور فارغ البالی کہتے ہیں وہ کسی طرح حاصل نہ ہوتی تھی۔

آرام کے بندو! دیکھو، بہت آرام بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے

آرام شاہ کے وزیر اعظم عیش اور نشاط دو شخص ہوئے تھے۔ مگر عیش نے دغا کی، کیوں کہ مرض ایک بڑا غنیم سلطنت کا تھا، وہ مدت سے ملک آرام کے درپے تھا۔ چنانچہ مرض نے عیش سے سازش کی اور ایک رات یکایک قلعہ جسم پر کمند ڈال کر شبستان شاہی میں آن پہنچا۔ جب مرض آیا تو آرام کجا۔ آرام نے دشمن کو بلائے ناگہانی کی طرح سر پہ دیکھا، گھبرا گیا اور ناچار ہو کر بھاگنا پڑا۔

ان دونو نمک حراموں نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور عیش و نشاط کی بدولت تمام عالمِ اجسام امراض اور بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ مرض کے سوا کئی اندرونی مفسد اور بھی سلطنت کے بدخواہ تھے۔ چنانچہ ایک سیری تھی، اور دوسرے اکتاہٹ؛ وہ بھی ملک کے دعوے سے ملکہ بننا چاہتی تھیں، دیکھنے کو بڑا سا پیٹ بہت پھولا تھا، لیکن حقیقت میں کچھ نہیں، فقط پھونس کا پُولا تھا۔ انھیں کوئی چیز مزا ہی نہ دیتی تھی اور ہمیشہ ہر چیز سے دل بے زار اور دل بھرا رہتا تھا۔ ان کی مصاحب ایک بدماغی، دوسری بے زاری تھی کہ آٹھ پہر منہ بنائے، تیوری چڑھائے، الگ کرسی پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جو نعمت انھیں ملتی، شکریہ کا حق خفگی اور بدمزاجی کے ہاتھوں ادا ہوتا۔ ملکۂ مذکور کی نگاہ میں یہ تاثیر تھی کہ ایک نظر میں ساری دنیا کی نعمتیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ کیسی ہی سہانی خوشبوئیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، ہرے ہرے سبزہ زار بہار پر ہوتے، مگر جب اس کے سامنے آتے، سب مٹی ہو جاتے۔[1] اس سے آرام کا لطفِ زندگی بالکل نہ رہا اور اس کے سبب سے رعایا کا بھی جی بے زار ہونا شروع ہوا۔

عیش کے بندے جب حد سے زیادہ دق ہوئے، تو طبیب کیا خوب ڈھونڈا ہے

رفتہ رفتہ سب ہمراہی آرام شاہ سے کنارہ کش ہو گئے۔ بعض بے مروت تو عیش سے گھل مل گئے۔ اور عیش نے بھی وعدہ کیا کہ میرے پاس دو حکیم ہیں، جن کی بانی

---

[1] کیسی ہی نعمت ہو، جب برابر ملے جائے، تو آخر دل سیر ہو جاتا ہے۔

کی بوند، تیزاب اور خاک کی چٹکی اکسیر ہے۔ سیری کی خاک اُڑ جائے گی۔ ہر ایک چیز مزا دینے لگے گی۔ اور ہر ایک بات کا لطف آئے گا۔ ان حکیموں کا نام حرص اور ہوس ہے۔ یہ سن کر بہت لوگ تو عیش کے پھسلاوے میں آکر حرص کے پیچ میں پھنس گئے اور جو عاقبت اندیش دانا تھے، وہ پھر تدبیر اور مشورہ کے پاس پہنچے۔ سارے دکھ سنائے اور جو مصیبتیں گزری تھیں، سب داستان بیان کی۔ انھوں نے بہت افسوس کیا اور کہا کہ خسرو آرام کی بدولت تم نے بہت آرام کیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کسی کام کے نہ رہے۔ محنت سے اس کا تدارک کیا اس کی تمھیں برداشت نہ ہوئی اور ضعف و ناتوانی سے فریاد کرنے لگے۔ عیش و نشاط سے تفریح کا بندوبست کیا۔ اس سے بہت لطف اٹھائے۔ مگر انھوں نے یہ سلوک کیا کہ امراض کے حوالے کر دیا اور آپ الگ ہو گئے، جس سے سب کی زندگی کا مزا جاتا رہا۔ ہم تمھارے معاملے میں حیران ہیں کہ کیا کریں۔ سب نے بہت منت اور التجا کی۔ آخر ان دونو کو ساتھ لے کر پھر سلطان محنت پسند کے پاس گئے اور خسرو آرام کی طرف سے پیغامِ سلام دوستانہ پہنچا کر صلح کی تدبیر کی۔

محنت کش ہزار ہمت کرے مگر کوئی نہ کوئی دشمن اس کے پیچھے لگا ہوا ہے

جس طرح خسرو آرام سیری کے ہاتھ سے عاجز آگیا تھا، اسی طرح سلطان محنت پسند کاہلی کے ہاتھ سے تنگ تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اُن کی سرحد پر گھات لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ غرض دونوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ باہم اتفاق کریں۔

حق یہ ہے کہ آرام بھی بغیر نہیں۔ اب ذرا محنت کا لطف دیکھو

غرض تدبیر اور مشورہ کی صلاح سے دونوں نے متفق ہو کر ملکِ فراغ اور کشورِ راحت کو باہم تقسیم کر لیا۔ محنت پسند خردمند کو دن کی سلطنت ملی اور خسرو آرام کو رات کی۔ دونوں سلطنتوں میں عہد نامہ ہو کر بنیادِ محنت کے استحکام کے لیے بندوبست ہونے لگے۔ چند روز بعد مشورہ کی وکالت سے یہ تجویز ٹھہری کہ خسرو آرام کی شادی سلطان محنت پسند

کے خاندان میں ہو جائے۔ محنت پسند نے کہا کہ آپ کے اہلِ دربار میں بعض اشخاص سلطنت کے خلاف مصلحت ہیں۔ اس واسطے جب تک آپ انہیں خارج نہ کریں گے، مجھے یہ امر منظور نہیں۔ خسرو آرام نے کہا کہ جس کو تم کہو، اسی وقت جلاوطن کر دوں۔ چنانچہ مشورہ وغیرہ مشیروں کی صلاح سے راحت، تکلف، بناؤ، سنگار وغیرہ سب نکالے گئے۔ ایک دن رسمِ شادی کہ وہ بھی سیدھی سادی تھی، سرانجام ہوگئی اور دونو سرکاروں کا انتظام ایک ہوگیا۔

جب آرام و محنت دونوں اعتدال سے ہوں تو کیوں صحت حاصل نہ ہو

اتفاق کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ چند روز کے بعد خسرو آرام کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام صحت شاہ رکھا گیا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ دونو طرف رسوم مبارکبادی کی ادا ہوئیں۔ گنہگارانِ سلطنت یعنی نشاط اور عیش کی خطائیں بھی اس خداداد خوشی کے شکرانہ میں معاف ہوئیں، مگر اس شرط پر کہ بے طلب سامنے نہ آنے پائیں، نہ بے تقریب بلائے جائیں۔ غرض صحت شہزادہ بی بی سلامت خاتون کا دودھ پیتا تھا۔ خواجہ پرہیز اسے پرورش کرتے تھے۔ ان ہی کی تعلیم و تربیت میں بڑا ہوا۔ چونکہ دو گھروں میں ایک چراغ تھا خسرو آرام اور سلطان محنت پسند دونو آنکھوں کا نور سمجھتے تھے۔ صحت شہزادہ بھی دونو بزرگوں کی برابر اطاعت اور دونو سلطنتوں کی برابر رعایت کرتا تھا۔ اتفاق کی برکت سے خدا نے دونو گھر روشن اور سلطنت آباد کی۔ اور خدا کے بندوں کو بھی آئے دن کی مصیبت سے نجات دی۔

———— ⁂ ————

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہدِ قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کِن کِن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیو زاد آکر ان کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا، تو یہ اس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، جو اِس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے، تو مرنا پڑتا ہے؛ ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابا فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے، اور جُزوی جُزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اُس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار اُمید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے

دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں۔ انھیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمود یے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ[1] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے، غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے؛ دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے، بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مُردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اُسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے، تو اُس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا، اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی نہیں سنتے، اس کان سنتے ہیں، اُس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی، سلطانِ آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوفہ نے ہوش سنبھالا، تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا، تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے

---

[1] ایک قسم کا شکاری کتا ہے، جسے ہندوستانی زبان میں گلڈانک کہتے ہیں۔

آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزّتِ دوام کا تاجِ مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالمِ سفلی میں دروغ دیو زاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اُسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے، تو چونکہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں، اُن کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و قوت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی؛ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں، آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پری پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی؛ اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال کا رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھاتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا، تو انسان کیا، فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا، ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا۔ تو وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چوں کہ یہ ان کی مدد کا محتاج

تھا، اسی لالچ کا مارا کمزور نابعداروں کی طرح اُن کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ، بے اوسان تھے، کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا، مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا وہوس اس کے یارِ وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالتے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونو کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پہ بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طرّاری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیر دل کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا وہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پَچ، پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی بادِ ہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھیرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا، تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا۔ اور رعبِ خداداد کا خود سر پہ دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی، تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال مُنہ پر لے، ہوا وہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا۔ اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی۔ مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے۔ اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا، تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں

بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربہ میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھیروں۔ اس لیے دھوکہ بازی اور شبہہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو،[1] مگر اس طرح کے اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہِ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اُس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی رستہ سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا، اور جدھر سے چاہتا تھا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اُس نے ساری دنیا پر حملے کرنا شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا، ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ چھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس سے جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پانو کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے مٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے مُنہ پھیرا، اُدھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی، تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات کہیں گے اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف ہٹی اور پھر بدعملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا،

[1] جب جھوٹ کی قلعی کھلنے لگتی ہے، تو جھوٹا آدمی ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے لوگ شبہہ اور شک میں پڑ جائیں اور سمجھیں کہ ہو تو سکتا ہے، شاید جو یہ کہتا ہے وہی سچ ہو۔

دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہر چند ملکۂ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیوں کہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوا مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی، تو گھٹتی تھی اور دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا امید ہوئی، تو غصّہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، ان ہی میں رہا کریں، اپنے کیے کی سزا آپ پا لیں گے۔
سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا، تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اُسی وقت عالمِ بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔ اُس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں فرمائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدرِ انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہیں، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاحِ وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے، اپنی سختی اور

تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، لوگ اُس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے خلاف ہے۔ اوّل تو اُس میں فارغ ابالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انھیں سوا عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے، وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہلِ انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کی طرزِ لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو چُھل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحتِ زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیبِ بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اس کا دخل ہوا، اُدھر اِدراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامہ کے اُترتے ہی اُس کی اصل روشنی اور ذاتی حُسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔ چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے، تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیلِ لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گلشن اُمید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں، مگر زمین جس قدر تخمِ اُمید کو پرورش کرتی ہے، اُس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اَور اَور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اُٹھتی ہیں یا بمقتضائے سِن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالتِ موجودہ ہماری خوش حالی یا بد حالی بھی ہو سکتی ہے، اُسی وقت اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیقِ ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانہ میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیشِ نظر رکھتا ہے کہ یا اُس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں، پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے، جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی، تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی، بیماری، قید، مسافرت، بہت سے دنیا کے دُکھ درد ہیں کہ امید نہ ہو تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا جیسے نرا سا مرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہر کس و ناکس میں عام ہو رہی ہے، وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس صورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی کیوں کہ حقیقت میں یہ مشغلۂ زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے، تو ایک دم گزارنا

مشکل ہوجائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے ۵

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر اُمیدِ وصل پر برسوں گوارا ہوگیا

اس میں شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے، جو انسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں۔ مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی کرتی ہے، تو اُسے ناکامی نہیں کہتی، بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کردیتی ہے۔ میں ایک رات انہی خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانۂ آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید وبیم اور نفع ونقصان کے سامان تیار کرلیتا ہے۔ یکایک آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے، تمام عالم رنگین وشاداب ہے۔ ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا، نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتا پا محو ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دلکشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۵۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں۔ آبِ زلال کے

---

۵ دیکھ لو، دنیا میں جوں جوں انسان کامیاب ہوتا ہے، اس سے آگے کی کامیابیوں کی ہوس دل میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔

چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہا تے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اٹھائی، تو اور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں، اُن کے بیتار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اٹھایا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا، زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی[۱] اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں، وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا، اور جو بہار تھیں، وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں، مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں[۲] گویا میرے شوقِ آرزو کو ڈھکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہونے ہوتے میں دق ہو گیا تھا، مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو، جو نعمتیں ڈھکا رہی ہیں، کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا کہ جس میں زن و مرد، خورد و کلاں بہت سے آدمی اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں یا کسی نشاطِ عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے مُنہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا، اور ایک ایک کی آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی

---

[۱] انسان کی طبیعت کا عجیب حال ہے جو ہوس پوری ہو جاتی ہے، وہ مزہ نہیں دیتی؛ اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق و شوق پیدا کرتے ہیں۔

[۲] جوں جوں حصول مراد میں دیر لگتی ہے، شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے اور امید بھی اس کے ملنے کے سامان سامنے دکھاتی جاتی ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے کہ وہ اُسی کے دل میں ہے۔ سب ملے جُلے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا، نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا[1]۔ بہت لوگوں کی گرمیِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزومند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو، تو انھیں اس کے بجھانے کی فرصت نہیں[2]۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا۔ اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہو سکتا تھا[3]۔ میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہوگی، اِسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اُسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر مُنہ پھیر لیا۔ اور کہا: "صاحب دق نہ کیجیے، آپ جانتے بھی ہیں، جس وقت کی ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے، وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا، افلاس زدہ اور طالبِ روزگار بیچارے، ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جان کنی سے خلاص ہو جائیں گے، بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہلِ عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں، وہ بھی بازو ڈال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے۔

میں نے بڈھے کو اس کی خشکیِ دماغ کے حوالے کیا اور وہیں ٹھیر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمتِ شکل اور آہستگیِ رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ اخلاق سے پیش آئے۔ مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اُس نے جُھک کر ایک سلام کیا اور کہا "اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی، تو میں بہت خوش ہوتا۔ مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں کیونکہ بیس برس سے میں ایک عہدہ کی امیدواری کر رہا تھا، اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔" میں نے

---

[1] انسان جس مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے کسی سے کب کہتا ہے، اندر ہی اندر تدبیریں کرتا ہے۔

[2] اپنے کام کے آگے کسی اور کی احتیاج کی کون پروا کرتا ہے!

[3] سچ ہے، بڈھوں کو جوانوں سے زیادہ ہوس ہوتی ہے۔

اُسے بھی چھوڑا اور ایک اَور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے، کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اُس کے پیچھے ایک اور شخص کو دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اس کے دریا ے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا۔ یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھیر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے۔ اور سرکارِ علم سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں، تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے۔ اب جو اپنی آنکھ کہے، وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو۔ کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اسے دیکھ دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سُنایا۔ وہ ہنسا اور کہا: "صاحب، جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ ملکہٗ امید کا باغ ہے۔ وہ ملکہٗ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو، بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لیے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا، یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔

آنکھ اُٹھا کر دیکھوں، تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوانِ عالیشان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزارِ جوانی عین بہار پر ہے، سرِ تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیرِ لب پارہ کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر، تاجِ مرصع، موتیوں کے ہار، خلعتِ زرنگار کشتیوں میں چُنے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے، اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں، اور بہارِ زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیشِ مدام اور فرحتِ دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ

میری ہی طرف متوجہ ہے اور اسی بھروسہ پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ رستہ کے دونو طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی۔ مگر ہرے درختوں نے سایہ کیا ہوا، دیواریں لپی ہوئیں، دروازہ پر روشن حرفوں میں لکھا تھا "قناعت کا آرام گھر"۔ بعضے تھکے ماندے ان میں چلے جاتے اور پانو پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ رستہ والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت میدان ہار گئے۔

باغِ اُمید کے دو دروازے

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی، اور اس جمگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ باغِ امید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں۔ ایک داروغۂ دانش کے اختیار میں ہے، دوسرا داروغۂ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغۂ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور الٹی سیدھی حجتیں نہیں کر لیتا، تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا۔ مگر داروغۂ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے۔ وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے۔ بلکہ جو اس کی حد میں جائے، اس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے، چنانچہ جو لوگ داروغۂ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے، یا جنھیں اس نے جانے نہیں دیا تھا، ان لوگوں کی بھیڑ اس دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغۂ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تخت گاہِ خاص کو

؎ یہ باتیں ہم پر روز گزرتی ہیں مگر کوئی خیال نہیں کرتا۔ دیکھو، یہاں انھیں کس خوبصورتی سے رنگ دے کر بیان کیا ہے عقل جب تک سب تدبیروں اور تجویزوں کے پورے بندوبست نہیں کر لیتی، تب تک کسی اُمید پر کوشش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہم و گمان کے بندے ذرا سا سہارا دیکھتے ہیں اور اُٹھ دوڑتے ہیں، وہیں ٹکراتے ہیں اور ناکام ہوتے ہیں۔

رستہ جاتا تھا۔ مگر اس راہ کی زمین پھسلنی، سڑک پتھریلی، رستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں۔ جب کسی قسمت والے کو داروغہ سے اجازت مل جاتی تھی، تو اس کٹھن گھاٹی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستہ کے اینچ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے اور جو بچاؤ کے مقام تھے، ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے۔ مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں، جن کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا راستہ سمجھے ہوئے تھے، وہاں کچھ ایسا نہلکہ پیش آتا تھا کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں الجھاؤں میں الجھتے تھے۔ صدہا رپٹنوں میں رپٹتے تھے۔ بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے۔ اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک دارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اُلٹے پھر آتے تھے۔ بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے۔ بعض بعض ایسے بھی تھے کہ اُن کی استقلال سے راہ تھی۔ وہ اُس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلہ کو دیکھ کر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی؛ یہ تو کامیابی نہیں ہوئی، حق تلفی ہوئی ہے۔ باقی جو لوگ کہ اخیر انعام لے کر پھرتے تھے، ان کا انجام یہ ہوتا تھا کہ دانائی، داروغۂ دانش کی بی بی، ملکہ کی مصاحب تھی، وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی، اُس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہِ اُمید کے مسافرو! چونکہ داروغۂ دانش کی تحقیقیں اور ان کے رستہ کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں، اس لیے میں نے داروغۂ خیال کی طرف رُخ کیا۔ یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی، مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے سر تا پا ساری نظر آتی تھی، اور اپنی عجائب غرائب، نایاب اور بیش قیمت پر سب کو برابر حُسنِ طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ پھر بھی لُطف یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جُدا جُدا انداز سے اُڑا رہی تھی، جس سے ہر شخص یہ جانتا

تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے، وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی امید نہیں۔ اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھیر سکتا تھا، کیوں کہ وہمی باتوں میں، پایداری کہاں؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے کیوں کہ اس رستہ میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو رستہ میں نے پایا ہے، وہ کسی کو ہاتھ ہی نہیں آیا۔

یہ ملا نصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے۔ بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے، جن کی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں۔ بعضے کہتے تھے "جو ہو سو ہو، انہی قدموں چلے جاؤ، بلا سے مر جاؤ"، یہ سب حکمتیں کرتے تھے۔ اس پر بھی زمین سے اٹھ نہیں سکتے تھے، اور اٹھے تو وہیں گر پڑے۔ مگر یہاں پڑے تھے، تاک ادھر ہی لگی تھی اور اس حال تباہ پر خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، ان پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے، جنھوں نے اس باغ میں آکر اوروں کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا۔ یوں ہی ایک جگہ پڑ رہے تھے۔ یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا اور ایک سنسان اور بے آزار موقع پر تھا۔ مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اسی یقین میں خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے، مگر انھیں کچھ پروا بھی نہ تھی، بلکہ یہ غم غلط لوگ اسی دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظرِ عنایت ہوگی۔

انہی بے پرواؤں میں مَیں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی

بات کرے، تو اس کا جواب دیتے تھے، اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔
اسی خیال میں یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا، تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت، بھیانک مورت، اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں کہ ان کی کسی کو خبر نہیں۔ ایک کو تو میں جانتا ہوں کہ غم ہے، مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہو گئے، اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلّائے، تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے میں بھی چونک پڑا اور دیکھا، تو کچھ بھی نہ تھا۔

سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے، اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں، یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے، نوجوان ہوئے اور اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمرِ انسانی کا عطر یہی ہے۔[1]

جب اس فقرہ پر غور کی، اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا، تو مجھے انواع واقسام کے خیال گزرے۔ اوّل تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار رہتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اس کا عاشقِ زار ہوتا ہے۔ پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتہً درد و مصیبت کی فریاد، خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور، ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔[2]

---

[1] بہت گرم وسرد زمانہ کے دیکھتا ہے۔ نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے۔ بچپن سے لے کر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے۔ جب گھس پس کر بڈھا ہو لیتا ہے، تو ذرا آدمی بنتا ہے، اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سُنے یا دیکھے اُسے کچھ سمجھ بھی سکے۔ [2] ابھی ایک طرف ناچ رنگ شادی اور مبارک بادی ہے، ابھی دوسری طرف سے رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ایک گھر میں دولت و اقبال کا جوش وخروش ہے، ابھی ایک صدمہ ایسا پڑا ہے کہ ساری خوشیاں مٹی ہو گئی ہیں۔ اِدھر آبادی ہے، اُدھر بربادی ہے۔ اِدھر ہوائے ترقی و جوشِ اقبال ہے، اُدھر ادبار کی آندھی۔ ابھی عمر کا جہاز صحیح و سلامت بادِ مراد پر چلا جاتا ہے، ابھی طوفانِ طلاطم میں غوطے کھا رہا ہے۔

اوّل تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے، تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب جانتے کہاں ہو، دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کچھ کشتیوں[۱] کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں[۲] کی غفلت سے، کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر تو ہم اُتر آئے ہیں، اب مانجھ دھار سمندر رہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں[۳]۔ یہاں کی ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اُس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیے ہیں، جو رستے بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے، نہ ملاح کی۔ فقط خدا کی آس ہے، اور بس ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے ذرا نظر اٹھا کر دیکھ تو لو۔ دیکھا، تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہرا نہ کچھ زور تھا، نہ شور تھا مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا، وہ اسے[۵] بلبلے کی طرح بہا

---

[۱] کمزور کشتیاں بچوں کے نازک جسم اور دھان پان سے بدن ہیں۔

[۲] اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیماردار مراد ہیں۔

[۳] یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاشِ معاش اور راہِ ترقی میں اُسے پیش آتے ہیں۔

[۴] یہ بڑے بڑے فاضل، عالم، ڈاکٹر، پروفیسر، مولوی، پنڈت ہیں، جو ہماری تعلیم میں مصروف ہیں۔

[۵] فی الحقیقت دنیا کی ابتدا کس نے دیکھی ہے، جو آیا یہی چلتا ہوا کارخانہ دیکھا اور چلتا ہی چھوڑ گیا۔

لے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو، تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ[1] کہاں سے شروع ہوتا ہے یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی، اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا۔ اور دھند[2] اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں، اور جابجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادِمراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے اور جو بچارے پیچھے رہ گئے تھے، ان پر قہقہے اڑاتے جاتے تھے[3]۔ مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا، یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے، اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے چڑھ آئے یا کاٹ کے جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آجائے[5]۔

سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطر نہیں۔ اگر ہے، تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے، اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اُسی مصیبت میں

---

[1] خدا کے معاملے غیب کے اندھیرے میں ہیں، کس کی عقل انہیں دیکھ سکتی ہے؟

[2] انہیں دنیا کے مکروہات، جسمانی بیماریاں، دشمنوں کی بدخلافیاں، اور اپنی بدپرہیزیاں اور بے اعتدالیاں سمجھو۔

[3] یہ بااقبال اور کامیاب لوگ ہیں، جن کی دنیا میں بن آئی ہے۔

[4] نادانوں اور جاہل دوستوں سے خدا بچائے۔

[5] بھلا عمرِ رفتہ کب آسکتی ہے اور جوان یا بڈھا آدمی بچہ کیوں کر ہو سکتا ہے!

بتلاتے تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں، وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں[۵]۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ الحمد للہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا، میں اس سے بچ جاؤں گا، اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا، میں انھیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے، مگر اسی راستے چلے جاتے تھے۔ اس پر بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے، تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لیے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے، تو سب چلاتے تھے۔ داد بیداد کرتے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا، کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے، تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں، مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے، نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں[۲] کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جان، بہتیرے ایسی بیکسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو

---

[۱] افسوس دنیا کے مزے ہمیں کیسا اندھا کر دیتے ہیں کہ انجام کے مکروہات اور خوف و خطر کچھ معلوم ہی نہیں ہوتے۔

[۲] انھیں پرانی عمارتیں، بڑے بڑے فاضلوں اور مصنفوں کے تذکرے اور نامی گرامی لوگوں کی یادگاریں سمجھو، پرانی عمارتیں، قدیمی مقبرے اور پرانے قبرستان۔

ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا۔ مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔ جس کشتی پر ہم سوار[1] تھے حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اُٹھانے کے قابل نہ تھے، بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے۔ اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں، ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو مستِ غفلت زندگی کے نشے سے سرخوش بیٹھے تھے، وہ بھی غمگین ہوگئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلے نامردوں کو زندگی عذابِ موت ہوگئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن راحتوں کی امید ہوتی ہے، اس سے بالکل مایوس ہوگئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطر[2] تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دُور ہی دور رہے۔ اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی، جو اُٹھائی نہ جائیں گی، وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے۔ اِس وقت کے لیے کچھ نہ کچھ مشغلے[3] نکال لیتے تھے۔ امید تو ہمیشہ اس رستے میں ساتھ ہی رہتی تھی، اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کی امید سے بہت راہ تھی ان سے اُس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے۔ مگر اُس میں اتنی سکت بھی نہ تھی، جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے۔ اور

---

[1] یہی تمہارا جسمِ خاکی ہے، جسے تم اچھی اچھی غذائیں کھلاتے ہو، ورزشوں سے تیار کرتے ہو، نہلاتے دُھلاتے ہو، گرم سرد ہواؤں سے بچاتے ہو اور جوں جوں بڈھے ہوتے ہو، وہ ناطاقت ہوتا جاتا ہے۔

[2] دولت مند، عیاش یا بڈھے زیادہ خطر کی حالت میں ہیں۔ مگر انہی کو غفلت زیادہ ہوتی ہے بلکہ مرنے کی بات سننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

[3] راگ رانگ، قصے کہانیاں، کھیل کود کی باتوں میں ایسے لوگ دل بہلایا کرتے ہیں۔

یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت امید کی باتیں ان سے مسخراپن کے طور پر تھیں، کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں، اتنی ہی بیجزی کے عہدنامے "تازے کرتی تھیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنھیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبا کے لیے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت خوشنما جزیرہ نظر آیا، اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا:

"بداعتدالیوں کا گلزار"۔ جہاں تک جزیرہ کی حد تھی، وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبتناک گرداب پڑتے تھے، جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں، نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں، وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا، اور خوشی میٹھے میٹھے سُروں میں پڑی، ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہگزرِ عام کا تھا۔ اس لیے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے، یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں کو ضرور طراوت دیتی تھی۔

ادراک کا ناخدا داہنے ہاتھ میں دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے رستہ سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی[۱] کھینے کے لیے ان سے ڈانڈ مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغِ سبز پر

---

[۱] عمرِ رواں کا جہاز چلا جاتا ہے، دنیا گذرگاہِ عام ہے۔ راگ رنگ، حُسن و جمال، عیش و نشاط کے یہاں جمگھٹ ہیں۔ دیکھنا کہیں ان کے مزوں میں آکر کود نہ پڑنا۔ ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہسپتالوں تک جانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے تھے[۱]، خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہوں گے، جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے۔ اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی خوش کریں۔ اور مہدلے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس سے نکلنا بھی غضب ہے۔ چھوا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرہ نے کشتی کو اس طرح کھینچا، جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے[۲]۔ جانے والے بھی گئے تو سہی، مگر بہت پچتائے اور جتنا زور تھا، سب لگا دیا، لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلا۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی تدبیر کارگر ہوئی، وہ بچے، مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے۔ اور نکلے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے، اسی طرح پھر موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی۔ اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لیے جاتے تھے[۳]۔ آخر اِدھر اُن کے زور گھٹتے گئے، اُدھر کشتیِ حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا اپنی کوتہ اندیشی پر بہت پچتاتا تھا اور ساوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ، ع من نہ کردم شما حذر بکنید خبردار، کوئی جزیرۂ بداعتدالی کے سامنے نہ آنا۔

---

[۱] عقل و ادراک انھیں ہر وقت بے اعتدالیوں، اور بدپرہیزیوں سے بچنے کو اشارہ کرتے رہتے ہیں، مگر ان بچاروں کی کون سنتا ہے۔

[۲] یہاں سوئی اور مقناطیس کو نہ دیکھو، اپنے اشتیاق اور رغبت کی بداعتدالی پر خیال کرو۔

[۳] بڈھوں کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے، کیسے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے، ان کے کاریگر بھی وہیں موجود تھے[1] بہت لوگوں کو اپنے کاریگروں پر بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انھیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ جنھوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا، وہ بھی کچھ بہت نہ جیے۔ روز بروز مرض بڑھتا گیا۔ آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد میں پہلو بچایا[2] مگر بہتیرے کاریگر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا ہو گئے۔

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا، تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے، وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے، انھیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یعنی بادِ مخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بچاروں کو محنتِ تدبیر کرنی پڑتی تھی، نہ غمِ انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے، وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے، مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی، وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا، تو یہی ہوا کہ امید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بے زار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت، سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا، تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے،

---

[1] یہ کاریگر حکیم جی ہیں، یا ڈاکٹر صاحب ہیں۔

[2] حکیموں نے کہا، بیمار کا علاج کرد۔ اس نے کہا، حکیم کا علاج کرد۔

دوربینِ الٰہی سے میری آنکھیں روشن کردیں، یا پھر جو دھواں دھار ہو رہی تھی، اُسے اپنی برکت سے اُڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ، صبح سعادت کا وقت ہے چمن ہلہلے، مرغانِ سحر کے چہچہے، پھولوں پر شبنم، صبا اور نسیم کم کم، جزیرے کے جزیرے میووں سے جھومتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا و شرفا خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق کے لباس پہنے، پھولوں کے طرّے سر پر، ہار گلے میں ڈالے، اِدھر اُدھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فوّاروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجومِ بہار اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جمگھٹ کر رکھا تھا کہ شورِ قیامت بھی آئے، تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغرِ دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آجائیں، تو اُڑوں اور اس باغِ فرح بخش میں جا پڑوں۔ لیکن اس پیرِ بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں، اِلّا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو، وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گل کاری کر رہے ہیں، حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمھاری نظر کام کر سکے، بلکہ جہاں تک تمھارا خیال دوڑ سکے، اس سے بھی آگے تک لا انتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہیں ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو دل چاہے اور طبیعت کیفیت اٹھائے، سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغِ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائقِ شان ہے۔ کیوں آزاد، کیا یہ انعام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو، تو دیجیے اور انھیں لیجیے۔ کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہیے، جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کیا موت سے

ڈرنا چاہیے ؟ کیا ملکِ عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیے ، جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں ؟ نہیں نہیں ، ہرگز نہیں ۔ اور سنتے ہو ! نہ سمجھنا کہ انسان جس کے لیے یہ بے زوال سامان ہیں' اسے یونہی پیدا کر دیا ہے ۔ دنیا مقامِ امتحان ہے ۔ ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں ۔ امتحان کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا ، آنکھ کھول کر دیکھا ، تو کچھ نہ تھا ۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں، تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ اس تقسیم کو مصیبت، اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے، تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا، اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ "تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے، لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہما، دُبلا پن کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا،

جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا، جس کا دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنّاتوں کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں۔ اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھی، تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی، مگر نگاہ میں افسردگی تھی، اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھوا تا تھا، اور لدوا تا تھا۔ اور مقامِ مقررہ پہلے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑ گڑاتا دیکھا اور اُن مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا، تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں، ایک شخص پُرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی، تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا، اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا۔ اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بُری تھی، اِس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سر پر دودِ آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیرِ خیال، اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے، لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے، تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ کچھ جدوجہد سے سر ہلایا، مگر جس طرح لدے ہوئے تھے اُسی طرح چلے گئے۔

بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھرّیاں پھینک رہی تھیں ۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکنے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی ۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے ۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے، مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے ۔ جب پاس آیا معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج و الم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں ۔ اس انبار میں انواع و اقسام کے سقم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا ۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا ۔ جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعہ تھا ۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراضِ نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے ۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بیوقوفی یا بداطواری[1] پڑی ہوئی نہ دکھائی دی ۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے، تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا ۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے ۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اُٹھائے بے پروا چلا آتا ہے ۔ اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینک دی ۔ مگر جب دیکھا، تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا ۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شُہدے آئے ۔ میں سمجھا کہ یہ اپنی کوتہ اندیشی کو پھینکیں گے، مگر وہ بجائے اُس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے ۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اُتار چکے، تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص

---

[1] مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بیوقوفی یا بداطواری کو کوئی بُرا نہیں سمجھتا ۔ اسی واسطے اسے کسی نے نہیں پھینکا ۔

خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انھوں نے جھٹ اپنا آیینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قدو قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہوگیا، اور ایسا گھبرایا کہ چہرہ کو نقاب کی طرح اُتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرہ کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا. یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کی برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پُرآفات پر غور کر رہے تھے۔ اور اس عالمِ ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے، جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے، جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کرلیں، اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی پھرت کے ساتھ انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں :

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا دردِ قولنج سے جان بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا، اس نے دردِ مذکور پھینک کر، ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا، مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ چھوڑ دیا تھا، چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑلی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا، چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا

لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

ایک بچارا جہازی غلام تھا کہ اس نے قیدِ زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہوکر اُس عذاب کو چھوڑا تھا اور جُھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑ کر بسُورر ہا ہے۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی حالت میں گرفتار تھے، اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا، وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہوکر اسے چھوڑا تھا، اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا، اور اسی طرح برعکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بچاری اپنے اَدل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہوگیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی، مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دُبلے تھے، اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی، مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہورہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہماری سہار کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں اُن کی عادت ہوجاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا، مگر مثانہ میں ایک پتھری ہوگئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی

زیادہ اُس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوٹے سر سے اونچے نکل آئے تھے۔ اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں، ان کا غول گرد تھا۔ یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں، تو اپنے مبادلے بھی مجھے صاف نہ گزر جانا چاہییے۔ چنانچہ اس کی صورتِ حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا، تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا، مگر میں بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی، اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی کیونکہ جب میں پیشانی سے عرقِ ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا، اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جب چہرہ پر ہاتھ پھیرا، تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا، وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے۔ سر کا یہ عالم تھا، گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے۔ اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اٹھاتا تھا، مگر یہ حال تھا کہ دونو طرف دو دو دائرے کھینچتے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالتِ غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں، اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بے زار تھے اور اپنے بوجھوں میں

دبے ہوئے، اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اُن وبالوں کو سر و گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا، وہ شیطانِ بابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اُس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اُس کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا، جو کوہِ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لاانتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

——— ⁂ ———

علوم کی بدنصیبی

تمہید

تمام صاحبِ جوہر اور کُل اہلِ کمال ہمیشہ سے ان نا لائقوں اور غلط نما با کمالوں کے ہاتھوں سے نالاں ہیں، جو فلک کی سِفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بِلّون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملہ میں اہلِ علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحبِ صنعت پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص و عام کی قدردانی پر منحصر ہے، لیکن بنیاد اس کی حکام یا اہلِ دول کی بدولت ہوتی ہے۔ اسی واسطے اس کی رونقِ بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حدِ قلم سے باہر ہے۔ اوّل تو اہلِ کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔ ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ اِن کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں، ان کی بدنصیبی یہ کہ جن قدردانوں پر مدارِ کار ہے، کبھی کثرتِ کار سے، کبھی بے پروائی سے، غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں، جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمرِ مراد آ پڑا، تو آ پڑا۔ نہیں تو ذلت، تباہی، اور دربدری کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ان ناگوار باتوں کو غلط نما باکمال گوارا کر لیتے ہیں، مگر اصل باکمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔

پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں۔ در بدر پھرتے ہیں۔ خوشامدیں کرتے ہیں۔ غرض کہ اس رستہ کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں، وہ ایک افسانہ کے استعارہ میں بیان ہوتی ہیں۔

آغازِ مطلب

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں، اور جس صدقِ دل سے جان فشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں، اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا، بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہر کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پروا نہیں رکھتے، وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطانِ آسمانی کے دربار میں عرضی کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدانِ خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف و عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔ دربار میں مشتری صدرِ اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی، تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں، سب جتائی اور دکھائی گئیں اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالمِ خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالمِ بالا کی طرف چلے آئیں اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرتِ انسان جنھوں نے یہ شوکت و شان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے، بھول بھلاری، گھاس پات چرتے پھریں گے، جنگلوں کے جانور بن جائیں گے۔ اور جوان سے زیادہ وحشی ہوں گے، وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس کے فیصلے کے لیے عالمِ بالا

میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو ارکینِ دربار کا رنگ ہوتا ہے، وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے۔ چنانچہ سب کا اتفاقِ رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیے۔

ملکۂ کوکب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالمِ خاکی سے تنہا، مگر اس کے نورِ جمال اور حسنِ کمال نے تمام عالمِ بالا کو روشن کر رکھا تھا، اور صداقت و حقیقت کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکۂ علم افروز کا خطاب عطا ہوا، اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا، جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں، رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا، اس پر ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان نے تارے اتارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اڑایا۔ اس نے بھی عالم میں آکر باپ کی طرف سے وہ شوکت و شان اور لیاقت دکھائی جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ خاک کا کرہ نور کی قندیل ہو گیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ استاد یعنی صداقت کی طرف سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھیں چنانچہ علوم و فنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے، وہ انہی کے ذریعہ سے آکر پیش ہوتے تھے۔

عالمِ بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اس کی فرماں روائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جلوسِ دربار کے لیے ہر طرح کے سامان بھیجے، اور بارگاہِ شاہی نے عجب شان و شکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آکر بیٹھتی، تو عدل و انصاف کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کھڑے رہتے۔ امید سامنے ناچا کرتی۔ قدر دانی دستِ راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارہ کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے۔

ایک دن ملکۂ علم افروز اپنی رفعت کے تختِ ہوادار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گزر ہوا۔ کوہِ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ دامن

کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھٹ رہا تھا۔ اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہو گئی۔ یہاں اگرچہ لُو بھی تھی، تو نہ بارش کی سیرابی سے، بلکہ گھٹاؤ کے پسینے سے سیل رہی تھی[۵]۔ اب اس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا۔ کچھ پھول تھے، تو روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے۔ وہ بھی چمک کر رنگ نکال لائے۔ غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا۔

روے زمین پر بہار کا یہ عالم دیکھ کر سلطانِ آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اُٹھا دو۔ عالمِ بالا کے پاک نہادوں نے گلدستے ہاتھوں میں لے لیے اور خوش ہو کر پھول اُچھالنے لگے۔

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گلزار اور شادابی سے نو بہار دیکھا، تو علمِ تعمیر وہاں آیا۔ اپنے کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گلزار لگایا۔ طرح طرح کے اوزار کام میں آئے۔ سڑکیں نکالیں۔ اُتار چڑھاؤ درست کیے۔ ریلیں جاری کیں۔ جا بجا فرودگاہیں اور ان میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے۔ غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی، وسعت حاصل ہو اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لیے سامان بہم پہنچیں۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی۔ قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رُو و رعایت دیے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ امید دروازہ پر بیٹھی رہتی تھی اور

---

۵ بند اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ نباتات بڑھتے ہیں، نہ ان کے پھول کھلتے ہیں، نہ پھل لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی اور چلتی ہوئی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے۔ یہ نہ ہو تو سب ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔

جن کے لیے علوم و فنون سفارش کرتے تھے، انھیں بلا لینی تھی۔ تمام دربار کثرتِ خلائق سے بھرا رہتا تھا۔ اور ہر چند اکثر ناکام بھی جاتے تھے، مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا کیونکہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی۔ جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے، ان کا نام نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا۔ پھر وہ عالمِ شہرت سے خارج ہو کر یا تو گمنامی کے گوشہ میں بیٹھ جاتے تھے کہ کوئی انھیں پوچھتا نہ تھا۔ یا ہیچ و پوچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے۔ بعض ایسے بھی ہوتے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہلِ نظر غباری عینکیں لگا لیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے غبار
آندھی ہو کر اٹھتے ہیں، ان کے اقبال کا دور آیا ہے۔

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے، نہ شرمندگی کے گوشہ میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیے ہر چند ملکۂ مذکور کا جوہر افلاکی تھا، مگر باپ کی طرف سے پیوند خاکی تھا۔ اس لیے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوتی تھی۔ اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بھی بہت جلد ہو جاتی تھی، مگر پھر بھی حریف جو تاک میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ اپنے، کچھ اپنے رفیقوں کے گھروں میں کمیٹیاں شروع کر دیں اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دیے۔ تمام عالم میں رفاہِ عام اور اصلاح، کا نام لے کر فریاد مچا دی، جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہو گئی۔ صبح و شام جمع ہوتے، لمبی لمبی تقریریں کرتے، مگر اس میں مطلب کا نام نہیں، جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے، جن میں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا۔ کوئی شمشاد قد ہو کر رائے شامل کرتا۔ کوئی تائید کرتا۔ کوئی تسلیم کرتا۔ آپ ہی اتفاقِ رائے کر لیتے، آپ ہی

واہ واہ، واہ واہ کرلیتے۔ اسی تودۂ طوفان کو لکھتے اور پرو سیڈنگ (روداد) نام رکھتے، جسے مشتہر کرکے بڑے فخر کیا کرتے۔

ان ناکاموں کی امید سے راہ تھی۔ اور بے حیائی ان کی بڑی خیر خواہ تھی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف دھکیلتی رہتی تھی کہ چلو اور دوبارہ دعویٰ پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے، نکالے جاتے تھے، اس پر بھی امید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی اور بے حیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انھوں نے ایک اور رستہ نکالا۔ یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری، جو امید کی حمایت اور بے حیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے، اس کی کثرت ہمیں ضرور فتحیابی بخشے گی۔ پس جس طرح ہو سکے، اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیے۔

جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے، تو خواہ مخواہ کے خیر خواہ، مشورہ دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر دیکھو، ان کی باتوں میں آکر حقیقت اور روانیت کو نہ بھول جانا چاہیے۔ خیال کرکے سنو، یہ خیر خواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں۔

اُدھر تو بے لیاقت اہلِ فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے، اِدھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اُترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالمِ خاک میں آکر نیت اُس کی پستی کی طرف زیادہ ترمائل ہونے لگی، اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئی۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی، یا غرور سے دوستی ہو گئی۔ آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لیا اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم و راہ بڑھی کہ اس سے شادی ہو کر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ایک اُن میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے فیاضی سے فیضِ تعلیم پایا تھا، اور خام خیالی نے قسمت سے۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں، جن کا اس نے دودھ پیا تھا۔ دوسری دایہ خود رائی تھی، اُس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خو بُو خاوند کی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ خود رائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو سبق پڑھائے تھے، سب بھلا دیے، اور عدل تو بے کار ہی ہو گیا۔ جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی، تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اُس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے۔ وہ بچارے بُجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے رہتے۔ ملکہ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اُس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے، برسوں کی دست کاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے، مگر صلہ کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے، ان کے لیے سب کچھ موجود تھا۔

جب ارکانِ سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گزر جائیں، تو اہلِ فساد کیوں نہ سر اُٹھائیں۔

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا، نہ علوم کے قدرداں وہاں رہے، نہ فنون کے جوہر شناس، تو چرچے اس کے جا بجا پھیلے اور ان نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں، جن کی علوم سفارش نہ کرتے۔ چنانچہ یہ خبریں سُن سُن کر اُن کے ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ کے دل سے دشمنِ بدخواہ تھے۔ ان باتوں کو اُس کے زوالِ دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ تر سرگرم ہوئے۔ اُدھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ اُمید، خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ اِدھر بے حیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمنِ مخفی جو شیطانوں کی طرح

پلیٹے ہوئے تھے، ملکہ کو ان کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرتِ انسان کا قاعدہ ہے، جب اپنی اوج پر آتے ہیں، تو اصلیت
کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں، بُروں کو بڑھاتے ہیں۔
ویسے ہی اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔

مقامِ افسوس یہ ہے کہ اب ملکہ کی شانِ شاہی نہ رہی۔ دکھاوے کی رسموں پر آگئی، زبانی جمع خرچ بہت، باقی ندارد۔ مبالغے، استعارے، بلند پروازیاں، الفاظ حد سے زیادہ، مضمون و مدعا غائب۔ کتابیں جلدیں کی جلدیں، مطلب پڑھو تو ایک حرف نہیں، یا تعریف اور خوشامد یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے تو زک و احتشام تھے، اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سُنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی، یا باہر ایک ایوان بنوا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا کہ امیدوار وہاں جاکر حاضر ہوا کریں۔ جن لوگوں کو بے حیائی، خوشامد کے سپرد کرتی تھی، وہ بے روک اُس گھر میں چلے جاتے تھے، کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آکر بھر گیا۔ ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے اور فقط حامیتیوں کے بھروسے پر اس جوش و خروش سے اظہارِ کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک پر ایک گرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے، تو غرض مندوں کے خیالات اس سے زیادہ
بگڑ جاتے ہیں۔ مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرض مندوں پر
کیا گزرتی ہے۔

جو لوگ اس دربارِ عام میں شریک ہوتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت میں پہنچ لیے، کیونکہ ان کے لیے بڑا قوی وسیلہ تھا یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقعیت دونو کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر

جا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا۔ اور وہ اپنے دل کی راجہ تھی۔ جب چاہتی تھی، کھول لیتی تھی۔ جب چاہتی تھی، بند کر دیتی تھی۔ غرض کہ بدنصیب غرض دار اپنی ساری عمرِ عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے کہ کبھی آس کبھی بے آس۔ ابھی خوش، ابھی اداس۔ اُس ایوان کے اندر دسواس داروغہ تھا اور امیدواروں کا یار بنا ہوا تھا۔ وہ دم بدم آتا تھا۔ اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو۔ اور امید کہتی تھی کہ ہاں ہاں اب حُسنِ قبول کا خلعت دلواتی ہوں۔

ساتھ اس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا۔ اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی دہکتی تھی۔ یہ سب اسی کی سپردگی میں تھے، اور باوجودیکہ اس حالِ تباہ میں گرفتار تھے، مگر بدقسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارتِ مذکور میں اندھیرا چھایا تھا۔ دیواروں پر اُلّو بول رہے تھے۔ گردِ بدنامی کی چمگادڑیں اُڑتی پھرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں، سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں۔ اور پردوں[۵] سے ایسی خرابی و خواری کی لونڈیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں، داغ پڑ جاتا تھا۔

حق داروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے، مگر نہ اس قدر کہ طوفانِ نوح کا مقابلہ کر سکے۔

ہر چند کہ جس شخص کے داغ لگتا تھا، نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی، مگر خدا جانے بڑھاپا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ بچاری

---

۵ یہ بیہودہ بے کمال اور نکتہ چیں معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر اُن کی آنکھوں میں چبھتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفات کو خراب کرتے ہیں۔

ہر چند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اُس دھبّے کو چھپا دے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچّا تھا۔ ذرا سا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اُڑ جاتا تھا کہ اُس سے دھبّے اور بھی روشن ہو جاتے تھے، اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ اُس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے، مگر وہاں سے اُس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا۔[۵]

طوفانِ بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے، تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے۔

چونکہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں، اس لیے اکثروں کو لے لیتے تھے۔ چنانچہ تاک میں لگے رہتے تھے اور جب موقع پاتے، کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خدمت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی، یعنی منتظر خانہ میں حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سنتا نہ تھا۔ کیونکہ ان بچاروں کو نہ فقط رشک بلکہ وسواس بھی ستاتا تھا۔ بے حیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے۔ اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ، داغ لگا دو۔ اخباروں میں چھاپ دو، اشتہار دے دو، سارے جہان میں رسوا کر دو۔ یہ بچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھٹ پڑتی تھی۔ کسی کا عمامہ رہ جاتا تھا۔ مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے، وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور جن کے وہ داغ لگا ہوا تھا، لوگ دور ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ یہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانے کی ہوا کھا آئے ہیں۔

---

۵ زمانہ کہ ہنر کا دشمن ہے۔ کیسا ہی اندھیر مچا دے، مگر خود بخود ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں، کاش کہ
وہاں قبول ہو،

باقی امیدوار اس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب خام خیالی اندر آنے کو اشارہ کرے اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں۔ یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اُسے خوش کرتے تھے۔ مگر نہ فصاحتِ اصلی، یا اشعارِ واقعی، یا خیالِ عالی سے، بلکہ برخلاف اس کے جھوٹی داستانیں، عاشقانہ افسانے، زٹلیات، ڈھکوسلے کہ اُن میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی اور اس کے شوہر یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی، کچھ بد دماغی کی چین جبیں میں چلے جاتے تھے۔ بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انھیں خود بھی امید نہ تھی۔ مگر تخت کے پا انداز میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں۔ جھٹ گلے میں ڈالیں اور وہیں باندھ دیا کہ ہر دم زیرِ نظر رہو، مگر اشاروں پر کام کرو اور اسی طرح زندگی بسر کردو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ ان زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام لے، بلکہ گالیاں بھی دے تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے۔ اس پر بھی خام خیالی جب چاہتی تھی پکڑ لیتی تھی اور زیور دلباس اُتار، پھر منتظر خانے میں دھکیل دیتی تھی۔

یہ لوگ وہاں آکر پھر طوفانِ بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ ہاں، بعض اشخاص جنھیں تجربہ کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا، وہ تو کسی اور رستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اور خوشحالی کی راہ ڈھونڈ لی۔ باقی وہیں

پڑے رہے۔ عمر گزار گئے، اور خوشامد کے ذریعہ سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلا آگیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی، تو گرد مکان مذکور کے بہت سے کمرے تھے، ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب بیماری، کاہلی، سستی، شرمندگی، مفلسی، مایوسی کے کمروں میں ڈال دیا کہ وہاں وعدے اور وعدہ شکنی، خوشی اور ناخوشی، امید اور نا امیدی میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ اور آخر ملکِ عدم کو چلے جائیں۔

دیکھو صبح کو رستہ بھولے شام کو گھر آتے ہیں

علوم وفنون نے بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزت نہیں، بلکہ بے عزتی ہے۔ ملک کے محل سے نکلے، تمام دنیا میں پھرے، تکلیف ومصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔ اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گذر ہوا۔ ایک بہتے چشمے کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی ہے۔ وہ تحمل کی بیٹی تھی، اور قناعت کی گود میں پلی تھی۔ چنانچہ سب سے الگ اس گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی تھی۔ اور کنجِ عافیت اس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقام علوم وفنون کو بھی گزران کے قابل معلوم ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا تو دانائی، دور اندیشی، کفایت شعاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسایش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے۔ اے اہلِ علم! اب وہی زمانہ ہے۔ عزت وآسایش چاہو، تو اس طرح گذارہ کرو۔

کیوں آزاد! مجھے تو اُن لوگوں پر رشک آتا ہے، جو شہرت کی

ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں، نہ انعام سے خوش، نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا، نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا، دلِ آزاد دے اور حالتِ بے نیاز۔

—— ٭ ٭ ٭ ——

علمیّت اور ذکاوت کے مقابلے

تمہید

جو لوگ علم و کمال کی مسندیں بچھا کر بیٹھے ہیں، ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ اول وہ اشخاص ہیں کہ جس طرح علم کتابی اور درس و تدریس میں طاق ہیں، اسی طرح حسن تقریر اور شوخیِ طبع میں براق ہیں۔ دوسرے وہ کہ ایک دفعہ کتابوں پر عبور کر گزرے ہیں، مگر پھر خالی ہڈیاں سمجھ کر ان کے درپے نہ ہوئے۔ ہاں! ایجاد و اختراع پر مرتے ہیں۔ کبھی تقریر کرتے ہیں، کبھی تحریر کرتے ہیں، مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے کہ قلم سے موتی برستے ہیں اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ تیسرے ایسے بھی ہیں کہ پیٹ کی الماری میں جہان کی کتابیں بھرے بیٹھے ہیں، لیکن تقریر کے میدان اور ایجاد کے موقع پر دیکھو تو فقط مٹی کا ڈھیر ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ آخر کے دونو باکمال ایک دوسرے پر حرف رکھتے ہیں، بلکہ حریف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان دونو کی ہمیشہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ اور مناظرے اور مباحثے جو آئے دن جاری رہتے ہیں،

---

* انگریزی وِٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا۔ میں نے وِٹ کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا۔ ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اس میں جو لفظی قباحت اور معنوی کوتاہی ہے سو ظاہر ہے۔ مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا۔ مجبوراً سب قباحتوں کو برداشت کیا کیونکہ غرض، مطلب کے سمجھانے سے ہے۔ جو صاحب اس سے بہتر لفظ پائیں، تحریر فرمائیں۔

ان میں مختلف منزلیں پیش آتی ہیں، جن کے اُتار چڑھاؤ سے اور اپنی غلطیوں کے سبب سے بار بار رفتار کے ڈھنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی طبیعتیں بھی مختلف ہیں۔ اسی واسطے دونو کے طرفداروں سے دو جتھے ہو جاتے ہیں، اور ان کے مباحثوں اور مقابلوں میں عجیب عجیب لطف دیکھنے میں آتے ہیں، جن کے نشیب و فراز کو غور سے دیکھنا اقلیم علم کے سیّاحوں کے لیے ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے تمھیں کسی گلزار ملک کی سیّاحی کا شوق پیدا ہو اور اُدھر کے کسی مسافر کا ایک سفرنامہ مل جائے، یا اس سرزمین کا ایک نقشہ ہاتھ آجائے کہ گھر بیٹھے وہ لطف حاصل ہو جائے۔ داستان مفصلۂ ذیل ان معرکوں کا ایک مرقع کھینچ کر دکھاتی ہے۔

صورتِ معرکہ

کہتے ہیں کہ اقلیمِ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام ملکِ فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا۔ بادشاہِ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں: ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا۔ یہ سیدھا سادا شخص حسنِ متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اُسے علم کہتے تھے۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسمِ بامسمّیٰ اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختہ کو شرمندہ کرتی تھی۔ چوں کہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں، دونو بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا تھا، اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی۔ یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک ایک

کو خاطر میں نہ لاتا تھا، بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے ان کی نا اتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنایت کی گرمیِ محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظرِ محبت کو دونوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا کیوں کہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دور تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ نئے نئے موقع جو پیش آتے تھے، ان میں عداوتِ مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونو کے دونو خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے تھے۔

جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالمِ بالا کے پاک نام نہادوں کی نظر اُن پر پڑنے لگی، اور وہاں کی بھانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہلِ کمال کو جمع کر کے رقاصِ فلک یعنی زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں۔ مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا اور اُس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو ٹھٹا ٹھٹا دیا۔ علم نے بہت بُرا مانا۔ چنانچہ اس کے توڑ پر قاضیِ افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی اور اپنے زورِ علم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طراریوں کی قلعی کھولنی شروع کی۔ اور مشتری نے عطارد کے اتفاقِ رائے سے عمامۂ فضیلت اس کے سر پر بندھوا دیا۔ اسے تدبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں کہ ماں باپ جن لوگوں کو مؤید سمجھ کر فہمایش اور اصلاح کے لیے کہا تھا، وہی چمکانے لگے، اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ اسی عالم میں دونو بڑے ہوئے اور اب انھیں عالمِ قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی

اس[۵] لیے نہ تھا کہ خود کچھ عزت و حرمت حاصل کریں، بلکہ ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ اپنے حریف کی عزت خاک میں ملائے اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے اُسے آگے نہ بڑھنے دے۔

آخر کار دونوں کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آپہنچا کہ رسم و رواج کے بموجب دربارِ آسمانی میں پہنچے۔ اوّل علم نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونو ہاتھ اٹھائے اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعائے بادشاہی میں اس حسنِ تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اس کے ذکاوت آگے بڑھی۔ زمینِ خدمت کو بوسہ دیا۔ مگر جب سر اٹھایا، تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیرِ لب کیا کہ گویا ایک چمن پھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونو عالمِ بالا کے پاک نہاد دل میں داخل ہو گئے۔ اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آبِ حیات کا جام بھر کر دیا کہ جب تک آسمان پر چاند سورج کا چاندی سونا ہے، تمھارا سکّہ روئے زمین پر چلتا رہے۔ دربارِ آسمانی میں قدیم سے ملنساری اور اخلاق کا انتظام تھا۔ افسوس یہ کہ اس وقت سے اُس میں خلل آگیا کیوں کہ دربار میں داخل ہو کر دونو نوجوانوں کے دماغ بگڑے اور دل نمود اور افتخار کے جوش سے بھڑک اُٹھے۔ پھر اس پر ساتھ والوں کی واہ وا غضب تھی کہ اُدھر اُسے بڑھاتے تھے، اِدھر اُسے چڑھاتے تھے۔ مگر ان حملوں کی بوچھاڑیں دونو کے جی چھڑوائے

---

۵ دیکھو، ہمارے بھائی بند جب آپس میں مباحثہ کرتے ہیں، یا لوگوں پر اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں، تو زیادہ تر حریف پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کے خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں، تصنیف و تالیف دکھا کر اپنے کمال کی تقویت نہیں کرتے۔

دیتی تھیں، جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا اور فتح کا یہ حال تھا کہ اَدل بَدل کرتی تھی۔ کبھی اُدھر کا پلہ جھکا دیتی تھی، کبھی اِدھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہو جاتا تھا کہ دو ٹوک ہو کر فیصلہ ہو جائے۔ جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی، تو ذکاوت اس زرق برق اور طمطراق سے آتی تھی کہ سب کو اُسی کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل کی طرح چہکتی، اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حملے میں تمام محفل مارے خوشی کے اس طرح چمک اٹھتی تھی کہ گویا کبھی نہ بجھے گی۔ اور علم روکھی پھیکی صورت بنائے اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا، یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش و خروش بگولے کی طرح گزر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو ٹھیراؤ شروع ہوتا، وہی علم کی طرف سے پکارتا تھا کہ اب ذرا ٹھیر و گے، تو خاطر جمعی سے سنو گے۔ پھر علم بھی دفیعے شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دفیعے روکھے سوکھے تو ہوتے تھے، مگر وہ یا تو حریف کے اعتراضوں کو آپس میں لڑا کر اس کی باتوں سے اسی کو جھوٹا کر دیتے تھے، یا یہ ذہن نشین کر دیتے تھے کہ ذکاوت کے دلائل اصلا قابلِ وقار و اعتبار نہیں یعنی اُس نے سارے مقدمہ کے مطلب کو تو لیا ہی نہیں۔ ایک ٹکڑا توڑ کر اس پر باتوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ اس تقریر کو سُن کر سب آپس میں تصدیق و تسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مگر پھر جب کہ ذکاوت کی رسیلی آواز نکلتی، تو سب کے کان اُدھر ہی لگ جاتے ہیں۔ شور و غل چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خاموش ہوتی کہ سناٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی، حریفانہ لطیفوں اور ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اُڑا جاتی کہ سننے والوں کے منہ میں تحسین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی۔ پھر اِدھر سے علم اپنے ہدایت نامہ کے طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اوّل تو ذکاوت کا اور اُس کے کلام کا سِفلہ پن دکھاتا کہ یہ متانت سے خالی ہے۔ جو جو رنگ اُس نے جمائے تھے انھیں حقیقی اور تحقیقی دلیلوں سے بلکہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح

مٹاتا کہ اہلِ نظر کو سوائے سرہلانے اور بجا و برحق کہنے کے، کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اہلِ محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا اور جب محفل کا خاتمہ کرکے اٹھے، تو علم کے دلائلِ صادقہ کے لیے عظمت دلوں میں لیے اٹھے۔ مگر جتنے اُس کی عظمت لیے اٹھے، اتنی ہی اِس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے لیے مہر و محبت لیے اُٹھے۔

جب دونو کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدر دانی کے لیے اہلِ نظر سے سفارش کرتے تھے، تو حسنِ طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے۔ ذکاوت تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دمک سے آتی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھیرتی تھی۔ علم بھی آگے بڑھتا تھا مگر اپنے وقار و متانت میں کمال بند و بست اور نہایت روک تھام سے قدم اٹھاتا تھا۔ ذکاوت کند ذہنی اور دیر فہمی کے داغ سے بہت بچتی تھی اور علم چوک جانے اور دھوکا کھانے کے سوا کسی تہمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ ذکاوت کی طرّاری کا یہ عالم تھا کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اُٹھتی تھی کہ ایسا نہ ہو میری تیز فہمی پر حرف آئے۔ علم کی یہ قباحت تھی کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا کہ حریف نے اپنی تقریر میں جو جو توڑ جوڑ مارے ہیں، اُن میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ برخلاف اس کے ذکاوت، علم کی ہر بحث کو جھٹ پٹ بلکہ اس گھبراہٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر پھر علم اس کی بات میں بال بال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا کہ سننے والے اکتا جاتے تھے، بلکہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا، ان کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دے کر وقت ضائع کرتا تھا۔ ذکاوت اپنی نمود کی ہوس میں ایسی ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی کہ جنھیں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر دل چسپ اور دل پسند خیالوں کو خوش نمائی سے دکھا کر کامیاب

بھی اس قدر ہو جاتی تھی جس کی اسے خود بھی اُمید نہ تھی۔

برخلاف اس کے علم اکثر قدماء کے قدموں پر چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے بچتا تھا اور ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں ان پیچوں میں پھنس جائے جنھیں اس کی نظر پیش بین دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آپڑتے تھے کہ اگر ذرا بھی ہمت کامیاب کو اور آگے بڑھاتا تو دشمن کو مار ہی لیتا۔ مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا، وہ روک لیتا تھا۔

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونو خالی نہ تھے اور اُسی نے دونو کو تیر ہائے اعتراض کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ ایجاد اور اختراع تو ذکاوت کے مصاحب تھے، اور قدامت اور تقلید، علم سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی واسطے ذکاوت کو تو وہی بات پسند آتی تھی، جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ علم کا قاعدہ تھا کہ بزرگانِ سلف کے قدم بقدم چلتا تھا اور اُن کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا۔ بلکہ اُس کے نزدیک جس قدر بات پُرانی تھی، اُسی قدر سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اس کے ذکاوت پرانے پن سے بہت گھبراتی تھی اور ہر رنگ میں نیا شعبدہ دکھاتی تھی۔ اُس کا یہ قاعدہ تھا کہ دلائل سے قائل نہ کر سکتی تو لطایف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ وا لیے بغیر نہ چھوڑتی تھی، اور اُسے قائل کرنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ مگر علم اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور نپے تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا کہ اگر مقدمہ اس کے برخلاف بھی فیصل ہو جائے، تو اس کے دلائلِ برجستہ کو یاد کر کے مدتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں۔

مناظرہ کے شوقینو! دیکھو، اب دونو حریف اپنی اپنی چال بھولتے ہیں

چند روز کے بعد اُن کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونو نے اپنی اپنی خاصیتِ اصلی کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جو حربہ حریف نے کیا ہے، یہی حربہ میں کروں، میں دو ٹوک فتح ہو جائے، یعنی اُس نے اُس کے رنگ لینے شروع کیے

اور اس نے اُس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ دونو طرف یہی چلتا ہتھیار ہو گیا، یعنی کبھی کبھی ذکاوت دلائلِ منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ علم اُن دلیلوں کو لچر سمجھ کر فقط مسکرا دیتا تھا۔ مگر اس طرح کہ اُن سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے طرف دار چلاتے تھے کہ واہ وا دلیل کا نام بھی نہ تھا، یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونو نقصان پر نقصان پاتے تھے اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سبک ہوتے تھے اور ذلتیں اٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح ذکاوت کی طبیعت میں متانت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا، اسی طرح علم کے کلام میں ظرافت کا نمک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا؛ دو قدم چلتا اور رگر پڑتا۔

یہ مباحثے ایسے مدت دراز تک جاری رہے کہ لازم ملزوم ہو گئے۔ اور عالمِ بالا میں بھی فرقے فرقے ہو کر دونو طرف جتھے بندھ گئے۔ چنانچہ ذکاوت کو زہرہ نے اپنے دامنِ حمایت میں لے لیا۔ اور تبسّم، تمسخر، مزاح، دل لگی کو اُس کے ساتھ کر کے کہا کہ حسن و جمال کی پریوں میں جا کر جلسے کیا کر۔ ادھر علم پر مشتری کی نظرِ عنایت رہی۔ مگر وہ تو خود خشک مغز تھے، اپنے محل سے باہر نہ نکلتے تھے اور جب نکلتے تھے تو عصمت حُرمت، عزت، محنت، اعتدال، تحمل، تقوی روکھے پھیکے کبھی کبھی کے بڈھے اور پُراتم بُڑھیاں جلو میں لے کر نکلتے تھے اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جا کر چلے آتے تھے۔

خوش بیانو! دیکھنا، طنز و تعریف کی نہ ٹھیرے، نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑے گی

نئی بات یہ ہوئی کہ ذکاوت کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لیے دو کار دانوں کی ضرورت ہوئی اور اس میں طنز اور تعریف آکر نوکر ہو گئے۔ انھوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا کہ جسے بعض دیوزاد کہتے تھے۔ اس کے ہاتھ

میں ایک کمان تھی اور پشت پر ایک ترکش آویزاں تھا، جس میں طعن و تعریض نے تیر بھرے تھے، اور عداوت نے زہر میں بجھائے تھے۔ ان تیروں کا اثر یہ تھا کہ جہاں لگتے وہاں ایسے جم کر بیٹھتے کہ نہ کسی جرّاح کا جتن چلتا، نہ کسی حکیم کا ہنر پیش جاتا۔ چنانچہ جب علم کسی امرِ مفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا، یا اپنے معتقدوں کو فیضِ علم پہنچاتا، اُس وقت ذکاوت کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بندوبست اور کچھ نہ ہو سکا، فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے نکتہ چینی اور غلط گیری کو دو ڈھالیں دے کر ساتھ کر دیا کہ اگر جواب ترکی بہ ترکی نہ ہو سکے، تو اس سے روکا کرو۔ چنانچہ یہ دونوں اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے۔ کبھی بھال نکال کر پھینک دیتے تھے، کبھی اُسی پر اُلٹ دیتے تھے۔

جب سلطانِ آسمانی نے دیکھا کہ اِن کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالمِ بالا کے امن میں خلل آنے لگا تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا کہ ان دونو جھگڑالوؤں کو عالمِ خاکی میں ڈال دے۔ چنانچہ آخر کار دونو دنیا میں آ پڑے اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دیے۔ یہاں دونو کے ساتھ بڑے بڑے گرم جوش معتقد جمع ہو گئے۔ ذکاوت نے اپنی خوشنمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزاجوں کو لُبھا لیا اور علم نے اپنی متانت و وقار سے پُرانے پُرانے بڈھوں کو پُھسلایا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے اور بڑے بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چنانچہ ذکاوت کے جلوس کے لیے گلزار اور پُربہار سیرگاہیں سجائی گئیں کہ جو اُس کے قدر دان ہوں، وہاں استقبال کو حاضر ہوں۔ اسی طرح علم کے لیے مدرسے، مسجدیں، درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں۔ دونوں جتھے اس پر جان دیتے تھے کہ شان و شکوہ اور ناموری اور دریادلی میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں، اس طرح کہ اپنے حریف کو گرد کر دیں۔ اور اس

عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہو، اسے واجب ہے کہ دونوں میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جا نکلے، پھر اُسے دوسرے کی نظرِ عنایت کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ اس خاکدانِ ظلمانی میں ایک خاکی جماعت تھی کہ وہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ روتی صورت، سوتی مورت، دولت کے بندے تھے اور اُسی کی عبادت کرتے تھے۔ زر و مال کے خزانے اُن کے عبادت خانے تھے۔ وہاں کیا علم، کیا ذکاوت کسی کی بھی دُعا قبول نہ ہوتی تھی اور سبب اُس کا یہ تھا کہ اُن کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوئی تھی اور کانوں میں غفلت کی رُوئی تھی۔ ذکاوت نے اُن پر بہت بہت گل افشانیاں کیں، مگر ان کے لبوں پر کبھی تبسم کا رنگ بھی نہ آیا اور علم نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی، مگر ان کی طبع خوابیدہ نے پھریری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر دولت کا ایک مُریدِ خاص ان پر تعینات تھا، وہ اُسی وقت آکر اُن کی آنکھوں میں ایک سُرمہ دے جاتا تھا کہ ہر چیز انھیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی۔ غرض اِن کی کم نظری اور بے اعتنائی، علم اور ذکاوت دونو کو بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ یہ دونو متفق ہو گئے اور اپنے اپنے معتقدوں کو چڑھا کر بھیجا۔ انھوں نے اسی وقت دولت پرستوں کے عبادت خانوں کا رُخ کیا، اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں اشاروں کنایوں کی چٹکیاں لیں، اور کسی کی بغل میں ظرافت کی گدگدیاں شروع کر دیں۔ اُس وقت سارے دولت پرست چونک پڑے اور جب کچھ نہ بن آیا، تو گھبرا کر روپے کو مدد کے لیے بلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا اور اپنے سارے ہتھکنڈے چلتر کام میں لایا۔ مگر کوئی پیچ اُس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ ذکاوت اور علم نے جو اپنے اپنے معتقد بھیجے تھے، اُن میں

پھوٹ ڈال دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دیے، یعنی جو کچھ ذکاوت اور علم تحریر کرتے، یہ جھٹ دولت پرستوں کو خبر جا پہنچاتے۔ بلکہ جب کچھ تجویز دولت پرستوں کی ذلّت کے لیے عمل میں آتی، تو یہ رشوت خوار کار گزار دل میں بُرا مانتے۔ اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی، تو دولت پرستوں کے سامنے خوشامد کے پیرایہ میں ظاہر کرتے۔ وہ باوجود اس کے کہ دل میں انھیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے، جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ دولت اور دولت پرستوں کے درجۂ عنایت تک جا پہنچے، تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بد دماغ ہوئے کہ جو اہلِ عزّت خود ان کے آقاؤں کے مصاحب تھے، اُن سے پہلو مار کر چلنے لگے اور اُن کے مقابل میں اپنے تئیں بہ نظرِ فضیلت دیکھنے لگے۔

القصّہ جب ذکاوت اور علم دونوں نے دیکھا کہ اہلِ دنیا کا وہ حال ہے اور جو نوکر اپنے تھے، وہ سب نمک حرام ہو گئے، تو دونوں نے مل کر دو عرضیاں تیار کیں، جن میں دولت اور دولت پرستوں کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بد ذاتیاں سب لکھیں اور سلطانِ آسمانی کی خدمت میں بھیج کر التجا کی کہ ہمیں ہماری قدیمی آرام گاہ میں جگہ مل جائے۔ یہ عرضی سُن کر سلطانِ آسمانی داہنے ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرجے۔ اِس کے یہ معنی کہ ان سب کا رُو سیاہ کرو، اور دونو ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس حسنِ طلب کو نہایت غنیمت سمجھے اور خوشی خوشی شکریے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے۔ ذکاوت نے جھٹ بازو پھیلائے اور غُبار سے دامن جھاڑتی ہوئے آسمان کو اُڑی۔ لیکن اُس فضاے لاانتہا میں کہ جہاں نہ راہ تھی نہ رہنما، نظر دور تک کام نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے چندہی قدم پر رستہ بھول گئی۔ علم رستے خوب جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی پر خوب ہلائے مگر اُن کے بازوؤں میں زور نہ تھا، چھوٹی چھوٹی اڑانیں کیا کرتے

تھے۔غرضکہ ہاتھ پانو مار کر دونو زمین پر آپڑے۔ اُس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے کہ اب اتفاق کے سوا گزارہ نہیں۔ ناچار دونو نے ہاتھ ملائے اور پھر اُڑے۔ علم کو تو ذکاوت کی قوتِ پرواز کا سہارا ملا اور ذکاوت کو علم دوربین نے رستہ بتایا۔ پلک مارتے سلطانِ آسمانی کے دربار میں جا داخل ہوئے۔ چونکہ بگاڑ کے مزے دونو نے خوب چکھ لیے تھے، اِس لیے اب کی دفعہ دونو میں بہت محبت اور اخلاص ہوا۔ مگر ذکاوت نے علم کو صلاح دی کہ بھائی، تم ذرا حسن ظرافت اور اس کی سہیلیوں سے نشست برخاست رکھا کرو۔ اسی طرح انھوں نے ذکاوت کو سمجھایا کہ تم ذرا صلاح و اعتدال کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرو۔ ان صحبتوں نے دونو کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا۔ علم کی خشک دماغی کو حسن اور ظرافت کی طراوت پہنچی۔ ذکاوت کی شوخی اور طرّاری نے صلاح سے اصلاح پائی۔ دونو آہستہ آہستہ عالمِ بالا کے پری زادوں میں ایسے ہر دل عزیز ہو گئے کہ جس جلسہ میں یہ نہ ہوں، اُس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چند روز کے بعد سلطان آسمانی کے ایما سے دونو نے شادیاں کر لیں اور اُن کی نسلوں سے علوم و فنون کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے۔

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو، اِس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدانِ جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنھیں اُسی ہاتفِ غیبی کا خطاب زیبا ہے جس کے الہام سے وہ مطالبِ غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں، جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعثِ فخر رہے، بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے، جس سے ملکِ فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی، جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اُس کے لیے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثوابِ آخرت کے لیے، یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں انھیں لوگوں کو لاؤں گا، جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر

کرتا ہوں، اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے کیوں کہ جن بے چاروں نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، ان کے حقے میں کسی طرح کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنّفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اُسی کے مقابلے میں گزری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اُس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اِس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں۔

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدانِ[1] وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں، جس کی وسعت اور دل افزائی میدانِ خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدانِ مذکور میں اِس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسبِ فکر شمار کرسکتا ہے، نہ قلمِ تحریر فہرست تیار کرسکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں، وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پانو نہیں جمتے تھے۔ ہاں، حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں، تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں، مگر

---

[1] اس میدان کو میدانِ دنیا سمجھ لو۔

نری نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرلے، تو اُن بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گزریں، وہی جانیں۔

یکایک قلۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی، اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی، جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے انبوہِ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے، جن کے کان اُس کے سننے کی قابلیت یا اُس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا، اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی، تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوب صورت خوب صورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سُنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں، نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے، کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستہ میں سفر کرتا ہے، تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھیں میں پھنس کر اہلِ ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اُن پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گوناگوں میوے جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں، اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر، پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندیِ کوہ کے اِدھر ہی اُدھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں،

وہ اگرچہ اقوام مختلفہ، عہدہا ے متفرقہ، عمرہاے متفاوتہ رکھتے ہیں، مگر وہی ہیں، جو حوصلہ کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت، عالی طبیعت تھے وہ اُن سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیِ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادہ سے آگے بڑھے کہ بلندیِ کوہ پر چڑھ جائیں، اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ عَلَم تھی، ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لیے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاجِ شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباسِ جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علمِ ریاضی اور جرثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا، جو اُس وقت کام میں نہ آرہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اُس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہو گیا۔ کوہِ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لیے۔ وہ تھوڑی ہی دور

چڑھے تھے کہ اُن کا راستہ ختم ہوا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دست کاری کی راہ لی تھی کہ روپیہ کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صِلہ چاہتے تھے۔ میں اُن لوگوں کے پیچھا تھا، جنھوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پالیے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم ہوئے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے مگر جب دیکھا، تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی لوگ ہیں کہ جہاں عقلِ صادق اور عزمِ کامل کام دیتا ہے، وہاں چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے، اُتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو مدد روزگار سے ترقیاں[۵] کرتے چلے جاتے ہیں، مگر کوئی ایسی حرکتِ ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں اور آئندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں، اوپر آکر دوشاہراہوں سے

---

۵ فی الحقیقت جو نا موری اور ترقی کے خواہاں ہیں اگر سلطنت، حکومت، دولت، شجاعت، علمیت، وغیرہ کے رستے سے چاہتے ہیں، تو خوفِ جان ہے۔ اگر اور فنونِ کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد انواع و اقسام کی بدذاتیوں سے سدِّ راہ ہوتے ہیں۔

ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحبِ ہمت دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دو نوشاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک ایک بھوت ڈراونی صورت، ہیبتناک مورت، کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درختِ خاردار کا ٹھنا تھا، بھوت کا نام دیو ہلاک تھا اور کانٹے وہی ترقی کے موانع اور موت کے بہانے تھے، جو اولوالعزموں کو راہِ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا، ٹھنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی، گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کی غول اہلِ ہمت بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ ہے ہے موت بسے ہے ہے موت!

دوسرے رستہ پر جو بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اُس کے ہاتھ میں نہیں تھا، لیکن ڈراونی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے، اس لیے اس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا، تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اتنے میں اُس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے تھے، اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑنے گئے۔ چنانچہ بہت سے جانباز جو شمشیریں عَلَم کیے ہوئے تھے، اُس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے، گویا حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا

تھا یہ اس دہانہ سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے، وہ اُس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اُس آواز کے ذوق شوق نے انھیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے، کپڑیں نہاتے مزیح کر یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی اِن بھوتوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا تو اِن کی دست رس سے باہر ہیں، اور رستہ بھی صاف اور ہموار، بلکہ ایسا خوشنما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جانبخش اور روحانی ہوا چلنے لگی، جس سے روح اور زندگانی کو قوتِ دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد وپیش دکھائی دیتا تھا، اُس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شام و شفق، جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرتِ عام اور کبھی بقاے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی اور تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور اس مجمعِ عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا، جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اُس کی چار طرف پھاٹک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختہ میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سُروں سے اب ایسی صدا آتی تھی۔ گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم، خیر مقدم! خوش آمدید، صفا آوردید" اِس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مؤرخوں کا گروہ ایک دروازہ پر استادہ ہوا تاکہ صاحبِ مراتب اشخاص کو حسبِ مدارج ایوانِ جلوس

داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے، اب اُس سے ظفر یابی اور مبارک بادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا، معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرہ کے گرد ہالہ کیے ہے۔ سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اُس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اُس کی حق داری، جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جان نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لیے آتے ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ، رنگت کا کالا، ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور بآواز بلند چلّایا کہ آنکھوں والو، کچھ خیر ہے؟ دیکھو، دیکھو، ترتیب کے سلسلہ کو برہم نہ کرو اور زرنگار کے نور کو اجسامِ خاک میں نہ ملاؤ۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا، تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اُس وقت ایک بمان یعنی تختِ ہوا دار آیا۔ وہ اُس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے جس نے رامائن نذر دی۔

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تختِ طلسمات کو تیس پریاں اُڑائے لیے آتی ہیں اُس پر

---

۵ کوئی اوتار کہتا ہے، کوئی بادشاہِ با اقبال

ایک اور راجہ بیٹھا ہے، مگر نہایت دیرینہ سال۔ اُسے فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ لینے کو نکلے، مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے اور تخت سنگھاسن بتیسی۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندنی چمکتی ہے، نہ آپ کا سنہ ہٹے گا، نہ سکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے، اور ارکینِ دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزارہ نہیں۔ اتنے میں وہی ۳۲ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ اُن کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا، جس میں ہیرے اور پنے کے نورانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی، جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا، وہ کالی داس شاعر تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگیِ جاوید بخشی ہے۔ اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے، اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اُس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش، جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوانِ پیل پیکر، ہاتھ میں گرزِ گاؤسر، نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے، ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اُس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں کہ درفشِ کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حُبِ قوم اور حُبِ وطن اُس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔

اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔ اور سر پہ کلاہِ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مؤرخ اور شعرا اُس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے اُسے بچشمِ تعظیم دیکھا۔ انہی میں ایک پیر مردِ دیرینہ سال جس کے چہرہ سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اُٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور و شور کے پڑھے۔ نہیں، بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی، جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گلِ فردوس کا ایک طرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ الٰہی یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی، شیر سیستانی، رستم پہلوان ہے۔ اور کہن سال مایوس فردوسی ہے، جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک جوان آگے بڑھا، جس کا حسن شبابِ نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاجِ شاہی تھا، مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمتِ یونانی چنور لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مؤرخ اور محقق اُس کے لینے کو بڑھے، مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے، جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مؤرخ تھا۔ اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔

فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آجاؤ کہ تمھاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے، جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کُلاہِ کیانی اور اُس پر درفشِ کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا عَلَم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا، گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اُس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی: "انھیں لاؤ۔" جو شخص داخل ہوا، وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرہ کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا، اُس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا: "اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔"

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رُتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اُس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا، اور بائیں پر جالینوس، اُس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجہ پر بیٹھے گا، مگر اس

مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے، مگر دلائلِ زبردست اور براہینِ معقول کے ساتھ سب اہلِ محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا، پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہِ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبّہ اور عمامہ اور طبل ودمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے، کیونکہ ہرچند ان کے جبّے دامنِ قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبدِ فلک کا نمونہ تھے، مگر اکثر ان میں طبلِ تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک انبوہِ کثیر علماء و فضلا کا ساتھ ہو لیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے ان کے ساتھ تھے، بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیر باد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا، اور جامہ خون سے قلم کار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے۔ مگر چوں کہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھا، کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہرچند یہ جواہرات اپنی آب داری سے پانی ٹپکاتے تھے، مگر جہاں قدم رکھتا تھا، بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے، مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوانِ حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔

اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہلِ اسلام کا رکھتا تھا، مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے مگر تمام علما و فضلاء میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہِ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے، مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصوّر ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصوّر بیشک اچھے ہو، مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مصوّر ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں، البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا، اس میں سے آبِ حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اِس لیے اُس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفعِ اعدا کے لیے تلوار دی ہے، مگر ملکِ مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگرچہ بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں، تو اعدا سے بدنہاد ہمارے خونِ عزّت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چنانچہ یہ عذر اس کا قبول ہوا، یہ انوری تھا، جو باوجود گُل افشانیِ فصاحت کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملہ میں اس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چوں کہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی، اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں

خلل انداز نہ ہو سکا۔

اسی عرصہ میں چنگیز خاں آیا۔ اس کے لیے گو علماء اور شعراء میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، سکا بلکہ جب اندر لائے، تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا، تو اس نے فوراً شمشیرِ جوہردار سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا: "سلطنت میں میراث نہیں ملتی"۔ علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے، وہ قصّاب ہے، بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعراء نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصورانِ تصانیف کی تحریر نے رنگِ بقا نہ ڈالا ہو، اُسے اِس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اِس بات پر اس نے بھی تأمل کیا، اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا، تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورۂ چنگیز خانی یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو مگر ان کاغذوں پر لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس کے لیے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا[1]۔ جس وقت اندر لائے، تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مردِ بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا، جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی، لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب، دوسری

---

[1] اس کے عہد میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی تھی خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانی کی تیار اس کی شاہدِ حال ہے۔

طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں، بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی، محقق کو شیخ بو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہِ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی۔ مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا کیوں کہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہلِ تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمھیں قلمِ تحریر دیا ہے، اُسے اظہارِ واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے، یا اغراضِ نفسانی اور بدزبانی میں؟ تمام مؤرخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ اس وقت تیمور نے ابن عرب شاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع، قطع تعلق کا لباس بر میں، خاکساری کا عمامہ سر پر، آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا، مؤرخ اور شاعر، سر جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر ٹھیرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی، تو کہا: معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے! اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہل دربار کا شوقِ طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ، کسی کو شربت، کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی۔

ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھتے۔ فقط اِس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظِ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا، جو فلکِ مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا، بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے؛ بیچ میں ان کے ایک پیرمرد نورانی صورت، جس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آدیزاں کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ، دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی، پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے، مگر انھیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیوں کہ ایسا کون تھا، جو شیخ سعدی اور ان کی گلستان، بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بے چارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر اُن سے واقف تھے اور اکثر اشتیاقِ غائبانہ رکھتے تھے، وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے، اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے۔ "دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں!"

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا، چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا، جس کے چہرہ سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں، تو مؤرخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی

جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا، گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ مگر پھر تاجِ شاہی پر اندازِ کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا، جس کو انبوہِ کثیر ایرانی، تورانی، ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا، تو تمام اہلِ دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور رضا مندیِ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان، اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا؛ نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے برادرانِ پرخون کا دعویٰ کیا۔ کہ اس نے میری حیاتِ جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا، اور وہ فتحیاب ہوتا، اگرچہ منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا: "نیت کا پھل ہے"۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا، جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود مخمور، نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحبِ جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی، پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا، اس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا؛ اور جو کچھ کہتا تھا، اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی، اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھ کھلتی تھی، تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا،

اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہجہان بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرّخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے۔ اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیے تھے، جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں، اور سینکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندیِ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچّوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا۔ اور بچّوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار، شاہجہان کا چھوٹا بھائی تھا اور بچّے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اُس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خودغرضی سے نہیں کیا، بلکہ خلقِ خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطینِ چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جبّہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا، مگر دوسرے ہاتھ میں جو فردِ حساب تھی، اُس میں غرق تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پڑتا لتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے، اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر منقطع اور معقول نظر آتا تھا، وہ دونو ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکینِ دربار، ہمارے ظلِ سبحانی نے اس کم بخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمھارے اعتراض اسے اس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اِس مسخراپن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب اخیر میں انھیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالم گیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خان عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان، دکھنی وضع، جنگ کے ہتھیار لگائے، راجگی

کے سکّے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اُس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے، بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا، مگر وہ کُرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحبِ ہمت کو جگہ دو یا نہ دو، وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیواجی تھا، جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دُور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنّفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیرِ برہنہ عَلَم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخملِ رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندوستان کا تاجِ شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیرِ ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو، نکالو، اِن کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا، جس نے سرحدِ روم سے بخارا تک فتح کر کے تاجِ ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی، جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا، کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انھیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے مُنہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے، مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے، کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آوازِ دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بے زار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالمِ ذی وقار، متقی پرہیز گار، دم میں ڈاڑھی چٹ، نمک کا سونٹا کندھے پر۔

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا، مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گُل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش بیانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے، مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس، جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب غرورِ ان سے دست و گریبان ہو جاتے، لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار اُن کے ساتھ تھا، یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسندِ عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس۔ اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر دہیں سے پھر کوئی بولا کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے، بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے

قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے؟ اسے دربارِ شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمہ پر قیل وقال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرہ سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادیِ ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چُپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مُردوں سے زندوں میں تو آیا۔

خاتمہ

اگرچہ خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں اور اشخاصِ تصوری زبان ہائے بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں لیکن سو کے قریب صفحے سیاہ ہو چکے۔ اب جلسہ ختم اور کچھ عرصہ کے لیے کلام کا دروازہ بند۔ اے اہلِ انجمن! آپ کا آنا مبارک آنا۔ قدم بر چشم، مگر جلسۂ آئندہ کی ابھی سے گزارش قبول ہو کہ حقّہ دُدیم کا سامان بہم پہنچے۔

جنّت الحمقاء

تمہید

مضمون مفصلۂ ذیل ایک مرقعِ خاص کی تصویر کا خاکہ ہے، جس کی صورتِ اصلی یہ ہے کہ ہم اور ابنائے جنس ہمارے کچھ اپنی غلط فہمی سے، اور کچھ کوتاہ اندیشی سے اعمالِ قبیحہ یا حرکاتِ ناپسندیدہ میں مبتلا ہیں اور باوجودیکہ اس کے حال و مآل کی قباحتوں سے آگاہ ہیں، بلکہ اور ہم صورتوں کو اُن کے خمیازے بھرتے دیکھتے ہیں، پھر بھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ جب اپنی جگہ بیٹھتے ہیں، تو اس ارتکاب کو داخلِ حُسن سمجھ کر اس میں افراط اور زیادتی کرنی سرمایۂ فخر سمجھتے ہیں۔ ایک شراب خوار آدمی یاروں میں بیٹھ کر فخریہ بیان کرتا ہے کہ میں کئی کئی بوتلیں برابر اڑا جاتا ہوں اور حواس میں بالکل فرق نہیں آتا۔ دوسرا اُس سے بڑھ کر اچھلتا ہے کہ میں پانی تک نہیں ملاتا، مگر آواز میں اصلا تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عیاش تماش بین اپنی روسیاہیوں کو کہتا ہے اور نہیں شرماتا؛ دوسرا اس میں اپنی شدتیں اور افراطیں بیان کرتا ہے اور خوشی سے رنگِ رخ چمکاتا ہے۔ ایک دغا باز منشی یا دیوان غبن کر کے آقا کے گھر کو برباد اور اپنا گھر آباد کرتا ہے اور جو جو دغل فصل حساب میں کیے، انھیں مسائلِ افلاطون کی طرح فخریہ سمجھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کرتے ہیں، ویسا بھرتے ہیں۔ مگر خدا جانے وہ کیا شے ہے جس نے ایسا پردۂ غفلت آنکھوں پر ڈال رکھا ہے کہ نہ وہ برائیاں معلوم ہوتی ہیں، نہ ان سے باز آتے ہیں یہی کوتاہ اندیشی کبھی ایک غلط فہمی کے لباس میں ظہور پاتی ہے یعنی اکثر اشخاص خاص خاص امور میں اپنے

کمال پر مفتخر اور نازاں ہوتے ہیں۔ ہر چند امورِ مذکور بجائے خود قابل فخر و ناز کے ہیں، مگر بشرطیکہ ان میں کمال نصیب ہو۔ فی الحقیقت اسے غلط فہمی کہنا چاہیے جو کہ نتیجہ حماقت اور ایک قسم کی کوتاہ اندیشی کا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی ابتدا میں ناواقفیتِ عوام کے سبب سے رونقِ بازار پاتے ہیں، مگر چند درجے طے کر کے گر پڑتے ہیں اور سخت ندامت اٹھاتے ہیں۔ افسوس کہ کوئی زمانہ اس قسم کے گناہوں سے خالی نہیں، بلکہ روز بروز حال ابتر نظر آ رہا ہے۔ اس لیے یہ مضمون ابنائے جنس کی عبرت کے لیے ایک استعارہ اور کنایہ کے رنگ میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ رنگ صورتِ مضمون کے منہ پر ایک باریک نقاب ہے، لیکن اگر اہلِ نظر چند ساعت کے لیے نظرِ غور کو تکلیف دیں گے، تو یہ استعارے اور کنایے صراحت اور وضاحت کے پہلو میں رکھے ہوئے پائیں گے۔

دل تیرا آپ پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں، مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائیِ فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی ہوئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بُری بھی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انھیں میں ہماری قدردانیاں ہوں۔ چنانچہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات، نئے مسخراپن ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں۔ اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کر کے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انھیں میں خلعتِ افتخار لیتے ہیں۔ اس فخرِ بے ہودہ اور خیالِ

بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیا داروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے یعنی رجنت الحمقاء)

لفظ آخر میں شاید لوگوں کو کچھ غلطی کا خیال ہو اور جو کچھ میں نے کہا، انھیں اس کی نسبت کچھ اور وضع دکھائی دیتی ہو۔ لیکن مجھے اب اس کا امتحان کرنا بے جا ہے کیونکہ میں جو اس وقت آنکھیں مَل رہا ہوں، تو یہی خواب دیکھ رہا تھا۔

ابھی سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزہ سے لہلہاتا، پھولوں سے چہچہاتا، جا بجا پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمتِ بلند کا نمونہ ہے۔ مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی۔ بلکہ ساعت بہ ساعت سینہ کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدان فراخ پایا، اور دور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آبِ رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤسِ مرصّع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے، اور اس بھینگی آنکھ پر ایک رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اُسے کوئی شے حالتِ اصلی پر نظر نہیں آتی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ملکہ غلط فہمی یہی ہے اور کل اہل عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

برابر اس کے ایک اور عجوبۂ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک۔ جس بات کی پسند یا ناپسند پر سر ہلاتی ہے، تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پسندِ عام اسی کا نام ہے۔ ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی ہے، اور دوسری دل ربائی کر کے جس شے پر چاہتی ہے سب کو شیفتہ و فریفتہ کر دیتی ہے۔ یہ دونو رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور

تسخیرِ خلائق کے عمل میں شہرہ آفاق ہوگئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ اُمڈے چلے آتے ہیں اور اگرچہ آمد کے رستے بھی دور ہیں مگر ہر رستہ انہی دونوں کی طرف جا ملتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی جو خود آرائی کے رنگ سے رُخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے، انھیں کچھ ہدایت یا اشارت کی حاجت نہ تھی؛ خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے، اور وہ عالم فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اسی طرح لبھاتی تھی کہ لٹو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں کچھ ایسی کل مروڑتی تھی کہ خود پسندِ عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا تھا۔

غرض کہ اسی طرح پھرتے پھرتے ہم ایک میدانِ جانفزا میں جا نکلے۔ وہاں دیکھیں تو پسندِ عام چہل قدمی کر رہی ہے اور بہت سے لوگ جو ہم سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے، اُنھیں پھسلا رہی ہے۔ آواز اس کی ایسی رسیلی تھی کہ دل مست ہوئے جاتے تھے۔ جب بات کرتی تھی، تو مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بولتی تھی، تو سانس کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ لطف یہ تھا، جس شخص سے بات کرتی تھی، جدا زبان اور جدا طرزِ بیان تھا اور جو سنتا تھا، یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ جوہرِ بے مثل جو خاص میری ذاتِ باکمال میں قابلِ قدر ہے، اسی کی بابت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ بس گویا اس جنتِ بے زوال کا فرمان ملا، جس کے انعام کا استحقاقِ کلی مجھ میں موجود ہے۔

غرص اسی حال میں ہم سب کھچے کھچے اُس کے پیچھے چلے جاتے تھے اور مسافتِ راہ میں یا تو اپنی خوبیوں کی خود آپس میں تعریف کرتے جاتے تھے، یا اپنی خیالی خوبیوں پر آپ ہی اتراتے تھے، یا جنھیں اپنی وضع کا نہ پاتے، اُن کی ہجو کرتے جاتے تھے۔ کچھ اپنے اپنے مدارجِ کمال پر آپس میں لڑتے جھگڑتے

چلے جاتے تھے۔

غرض اسی عالم میں چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا جو کہ اسم بامسمّٰی اندھیریا باغ تھا۔ اس کے دروازے پر دیکھیں، تو غلط فہمی بیٹھی ہے۔ مگر جس مکان میں وہ بیٹھی تھی، اسے عمداً ایسی حکمتِ عملی سے بنایا تھا کہ صورت اس کی دُھندلی سی نظر آتی تھی۔ اس نے کچھ سفید سا لباس پہنا ہوا تھا کہ جس سے دیکھنے والوں کو ملکہ صداقت کا دھوکا ہوتا تھا اور چونکہ شہزادی صداقت پری ایک مشعل بھی ساتھ رکھا کرتی ہے جس سے اپنے عاشقوں کو حُسنِ خدا آفرین کی خوبیوں کا جلوہ دکھاتی تھی، اُس نے اس کے جواب میں داہنے ہاتھ پر شیشۂ جادو اور بائیں ہاتھ پر سحرِ سامری کی چھڑی رکھی تھی۔ انہی ٹونے ٹوٹکوں سے دلوں کو لبھاتی تھی اور دھوکے دغا سے سب کو پرچاتی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی بڑی تمکنت سے ہاتھ بڑھا کر اُس چھڑی کو اُٹھاتی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی تھی۔

اس کے علاوہ نرگس جادو بہت ناز و انداز کے پھول اور نمود و نمائش کی کلیاں گودیں بھرے کھڑی تھی، انھیں اہلِ اشتیاق کے سامنے بکھیرتی جاتی تھی۔

دفعتہً عصا کا اشارہ آسمان کی طرف ہوا اور ساتھ ہی اس کے سب کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ ایک نیلا قطعہ آسمان کا ایسا صاف و مصفا دکھائی دیا جیسے صبح بہار میں فلکِ فیروزی کا رنگ نکھرا ہوا ہو۔ اسی فضائے دلکشا میں ملکۂ خام خیالی کا محل نظر آیا کہ آسمان سے باتیں کرتا تھا، مگر نہ معلوم ہوتا تھا کہ کون سی بنیاد ہے جس پر یہ قائم ہے۔ فقط پیچ در پیچ بادلوں کا ایک زنجیرہ تھا کہ جادو کے زور سے اَدھر کھڑا تھا، اُس کی چڑھائی کا راستہ جو ہمارے زیرِ قدم تھا، قوسِ قزح کی طرح خوش رنگ و خوشنما تھا۔ نسیم جاں بخش جوادھر اُدھر سبزہ پر لوٹتی تھی، ہر جھونکے میں عقل و حواس پر جادو کی پڑیاں مارتی تھی۔ تمام دیواریں طلسمات کے رنگ سے دم میں سُنہری تھیں، اور دم میں روپہلی۔ سب سے نیچے کے درجے کے ستون اگرچہ باغِ ارم والی تراش پر اندرے

تھے، مگر برف کے تراشے تھے۔ چھت کا گنبد نہایت عالی شان تھا۔ لیکن برج کی جگہ ایک شیشے کا بلبلہ دھرا تھا اور اس کے کلس پر طائرِ خیال کا ہُما پر پھیلائے تھر تھرا رہا تھا۔

مسافروں نے وہاں پہنچ کر نہ کوئی دربان پایا، نہ کسی کا انتظار کیا۔ جو آیا اپنے جوہرِ قابلیت کو پروانۂ اجازت سمجھے ہوئے بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ دربار کے کمرے میں پہنچے، تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی نمودِ بے بود صورتیں ہیں کہ ہم ہی میں ملی جلی اہتمام کرتی پھرتی ہیں۔ اور اس انبوہِ بے تمیزی میں اپنے خیالات کے بموجب ایک ایک کے درجے قائم کر کے صفیں ترتیب دیتی پھرتی ہیں۔ مدارجِ عزت بھی وہاں روشن ہوتے ہیں، مگر ساعت بہ ساعت دھوپ کی طرح ڈھلتے جاتے ہیں، اور لوگ تھے کہ بتاشے کی طرح بیٹھے جاتے تھے۔ استحقاق پوچھو، تو دادا پردادا کے وقت کا ایک پھٹا پرانا ساچغہ تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک طرف لاف گزاف تھی جس نے خود اپنی ذاتِ خوش صفات کا ایک قصیدہ بنا رکھا تھا۔ آپ ہی اس اعمال نامے کو پڑھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اسے اپنے سوا دوسرا ذکر نہ تھا۔ اکڑ تکڑ تھی کہ پنجوں کے بل چلتی تھی اور اینٹھتی پھرتی تھی۔ خود پرستی ایک طرف آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آپ ہی اپنے تئیں دیکھتی تھی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ کمرے کے صدر میں تختِ شاہانہ اور آگے ایک شامیانہ اس شان وشوکت سے سجا ہوا تھا کہ جس قدر سجاوٹ کے گمان میں گنجایش اور حوصلۂ آرایش میں وسعت تھی، سب اس میں خرچ ہوگئی۔ تخت پر ہالۂ ماہ کا چتر، اس کے نیچے ملکۂ خام خیالی[*] مہتاب آتش بازی کے دو پر لگائے پری بنی بیٹھی تھی۔ جو اس کے خیال پرست تھے، وہ اُسے پری حسن آفریں کہتے تھے اور زہرۂ ثانی اعتقاد

---

[*] سے بات تو سچ ہے۔ خام خیالی ہی سے خود پرستی پیدا ہوتی ہے۔

کرتے تھے۔ ایک نوجوان تخت کے پہلو میں کھڑا تھا اور ہر ایک کو سامنے لاکر سجدے کرواتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کا رشید بیٹا ہے، اور شہزادہ خود پرست اس کا نام ہے۔ اس کی خود پسندی اور خود بینی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نظر اپنے ہی بیچ میں غرق ہوئی جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر کی شے اسے اصلاً نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی لوگوں کا یہ حال تھا کہ ملکہ سے زیادہ اس کی طرف جھکتے تھے۔

ایک گلاب پاش اس کے ہاتھ میں تھا، بقدرِ حیثیت ہر شخص کے سر پر چھڑک دیتا تھا کہ خود پسندی اور بلند نظری کے خمار سے دماغ ان کے آسمان پر پہنچ جاتے تھے۔ تماشہ یہ تھا کہ شہزادہ جو جو ہتھیار فتوحات کے لیے کام میں لاتا تھا، وہ انھیں لوگوں سے لیے تھے جن کو شکار کرتا تھا۔ چنانچہ جس بہادر کو اپنے تیر کا نشانہ کرتا تھا، اسی کے سر کی کلغی نوچ کر اپنے تیر کی پَر گیری لگاتا تھا۔ جس نیزے سے اہلِ علم پر وار کرتا تھا، وہ انھیں کے لکھنے کا قلم تھا۔ جس تلوار سے دولت مندوں کو دو پارہ کرتا تھا، اس کے قبضہ پر انھیں کے خزانوں سے لے کر سونا چڑھاتا تھا۔ ناظمانِ ملک کے لیے دامِ تزویر بناتا تھا کہ پھندے اُس کے انھیں کی بندشِ تدبیر سے اڑائے ہوئے تھے۔ صاحب جمالوں کے رخساروں سے گرمیِ حسن لیتا تھا اور عاشقوں کے ساتھ اُسی میں اُنھیں بھی گرماتا تھا۔ یہاں تک کہ حُسن کے پھول خود بخود کُملا کر رہ جاتے تھے۔ نصیحوں کی زبانوں سے بجلی کی تڑپ نکالتا تھا کہ اپنی آگ میں آپ ہی جل کر خاک ہو جاتے تھے۔

تخت کے نیچے تین چڑیلیں پریوں کا بھیس بھرے حاضر تھیں۔ اوّل تو خوشامد تھی کہ بڑی خوش ادائی سے رنگ آمیزی کا تول سنبھالے کھڑی تھی۔ دوسری ظاہرداری آیینہ سامنے رکھے، اپنے فن کی مشق کر رہی تھی۔ بعد اس کے خوش رواجی تھی، جسے اب تک ہم بھیڑ چال کہتے تھے، مگر اسے دربار سے رعنائی اور خوشنمائی کا خطاب ملا تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ہر نگاہ میں گرگٹ کی طرح نیا رنگ بدلتی تھی، اور

ہزاروں شکاروں کو ایک جال میں گھسیٹتی تھی۔

غرض کہ شہزادہ خود پرست، شمشیر کے زور اور تدبیر کی لاگ سے برابر فتوحات حاصل کیے جاتا ہے اور یہ تینوں دولت خواہ اس کے استحکام اور محافظت میں برابر مصروف تھے۔ ہر کام کا مہتمم اپنا حق صدقِ دل سے ادا کر رہا تھا۔ چنانچہ خوشامد جس شے پر ضرورت دیکھتی تھی، نئے سے نیا رنگ چڑھا دیتی تھی کہ ہر دل کی آنکھ کو خوش آتا تھا۔ ظاہر داری ایسے ایسے ڈھنگ سے نمائش دیتی تھی کہ کیسی ہی بد نما شے ہو، خوشنما ہو جاتی تھی۔ خوش رواجی کا یہ عالم تھا کہ موٹے موٹے عیب ہوتے، انھیں ڈھانک دیتی، بلکہ اُن پر ایسی خوبیاں چپکاتی کہ جنھیں اس سے کچھ لگاؤ بھی نہ ہوتا۔

میں اِن حالات کو نگاہِ غور سے دیکھ رہا تھا، جو ایک آواز دردناک کان میں آئی۔ گویا کوئی کہتا ہے: "ہائے آدم زاد، ہائے تیری غفلت! خود رائی سے ہدایت پاتا ہے، غلط فہمی کے دم میں آجاتا ہے، خود پسندی کی اشتعالک سے چمک اٹھتا ہے، خام خیالی کے قدموں پر چل کر تعلیم پاتا ہے، یہاں تک کہ مفلسی اور خواری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔" یہ کلمے ابھی زبان بہ زبان پھیلنے نہ پائے تھے، جو دفعتاً ایسی ہلچل پڑی کہ تمام انبوہ تہ و بالا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک طرف سے رستہ کھلتا معلوم ہوا۔ دیکھوں، تو ایک بڈھا نورانی صورت، معقول وضع ہے، جس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت برستی تھی۔ اسے گرفتار کیے لاتے ہیں اور جو کلام عبرت انگیز نصیحتاً اس نے زبان سے نکالا تھا، اس کی سزا دینے کے لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے آئینِ حکومت میں سراسر باعثِ خرابی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، فقط اپنے بری الذمہ ہونے کو کہا تھا۔ اس کا نام ناصح دانش تھا۔

مگر لوگ ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ اس بچارے کی بات سننی بھی گوارا نہ تھی۔

بلکہ اُسے ایسی خواری اور زاری میں دیکھ کر خام خیالی تو مسکراتی تھی، خود پسندی تیوری چڑھاتی تھی، خوشامد اسے ذرا راست باز سمجھتی تھی؛ اس نے اتنا لحاظ کیا کہ برقع اوڑھ کر برابر سے نکل گئی۔ ظاہرداری نے اپنا پنکھا اٹھا کر اس کی اوٹ میں منہ چڑا دیا۔ کسی نے اس بیچارے کا نام حاسد رکھا، کسی نے عیب جُو کا خطاب دیا۔ رواج نے دھوم مچادی کہ بد اطوار سلطنت کے برخلاف بغاوت پھیلانی چاہتا ہے۔ غرض اس پیر دیرینہ سال نے ہر طرف سے ذلت ہی ذلت اُٹھائی اور اس جرم میں کہ ایسے ایسے لائق و فائق معززوں کے حق میں گستاخی کی، چاروں طرف سے دھکے کھائے۔ بلکہ تحقیق خبر لگی کہ اگرچہ اس وقت نکالا گیا ہے، مگر حکم ہے کہ آیندہ اگر کہیں صورت دکھائی تو اس کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔

بڑھے بے چارے نے جو کچھ کہا، اس میں سے بہت کچھ تو میں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ باقی باتوں کے لیے سوچ رہا تھا کہ دیکھیے، کس رنگ سے پوری ہوں۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک غل اٹھا اور ظلم و ستم اور بے انصافیاں چڑیوں کے برن میں اسی طرح اُڑنے لگیں، گویا آندھی آئی۔ انھوں نے اس کثرت سے ہجوم کیا کہ دروازہ تیرہ و تار ہوگیا۔ بیوقوفی اور بے اعتباری نمودار ہوئیں۔ تکلیف، شرم، رسوائی، حقارت، مفلسی سب آگے پیچھے حاضر ہوئیں۔ ان کے آتے ہی ادھر تو خام خیالی جو سونے کی چڑیا بنی بیٹھی تھی، اُدھر شہزادہ خود پرست، ان کے ساتھ ساری پریاں دم کے دم میں ہوا ہوگئیں۔ ادھر تمام معتقد اور ہوا خواہ ان کے بھاگ بھاگ کر کونے گوشے اور سوراخوں میں گھس گئے۔ مگر ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا۔ اُسے کہیں سے دوربین ہاتھ آگئی۔ چنانچہ اس نے دیکھا اور دفعتہً بولا کہ وہ گرفتاری کا حکم ہوا، وہ سو آدمیوں کا غول جیل خانے کو چلا، دو ہزار آدمی تہ خانہ میں قید ہونے کو چلے، وہ سب اندھیری کوٹھریوں میں بند ہوگئے۔ مراد اس قید سے زندگی کے عذاب،

دنیا کے دھندے، مکر و فریب کے جھگڑے تھے۔ جن مکانوں میں وہ لوگ ڈالے گئے، اُن کی خرابی دیکھنی چاہو، تو دلہا ے پریشاں کی بدحالی کو دیکھ لو۔ وہ لوگ اگرچہ یہاں ہائے واے بہت سی کرتے تھے، مگر نکلنے کے رستے کی طرف کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے ناک چڑھا کر کہا کہ یہ کم بخت اپنی حماقت اور شامتِ اعمال سے آپ یہاں پڑے ہیں۔ نہیں تو نہ یہ مکان اُن کی شان کے قابل ہیں، نہ یہ اخراجات اُن کے سامان کے لیے کافی ہیں۔ خیر ہم نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں۔ اب یہ محل ہو چکے گی، تو پھر وہی بہار کا سماں ہو گا۔

جب میں نے یہ سنا، تو اس کارخانہ کی ناپایداری نے میرا دل بے زار کر دیا۔ میرے رفیق نے جو خبر دی تھی، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مگر جب دیکھا کہ بغیر گرفتار ہوئے یہاں سے نہ سرکے گا تو میں چپکے سے دروازہ کی طرف کھسکا، اور چند اور شخصوں میں جا ملا کہ جو صداقت اور واقعیت کو مانتے تو نہ تھے، مگر ان شامتِ اعمال کے گرفتاروں کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ جب ہم دروازے کی دہلیز پر پہنچے تو دل پر صدمۂ عظیم گزرا۔ یعنی وہاں آ کر غلط نمائی کا پردہ آنکھوں سے اُٹھ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس محل کی بنیاد بالکل نہیں، معلق ہوا میں کھڑا ہوا ہے۔ اوّل تو ہم نے سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ موت کا کنواں ہے، آنکھیں بند کرو اور کود پڑو۔ مگر اس پہلی ہوسِ بے حاصل پر دل کو ہزار لعنت ملامت کی، جس نے اس عذاب میں گرفتار کیا۔

اب مقامِ تعجب یہ ہے کہ جس قدر یہ سب اپنے اپنے دل میں غور کرتے جاتے تھے، اتنا ہی وہ محل ہمیں نیچے اتارتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جو حالت ہم اپنے مناسب حال دیکھتے تھے، اسی انداز پر آ کر ٹھیر گیا۔ رفتہ رفتہ تھوڑی دیر میں جہاں ہم کھڑے تھے، وہ مقام زمین سے لگ گیا۔ ہم سب نے نکل کر اپنا اپنا راستہ لیا اور محل

آنکھوں سے غائب ہوگیا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ اس میں رہے، ان پر کیا گزری اور انھیں ہمارے اتر جانے کی خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ نہیں ہوئی۔ خیر جو ہوا، سو ہوا۔ اس سوچ میں دفعتًہ میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب و خیال ہوگیا، مگر نصیحت ہوئی کہ اب خام خیالی کے اشاروں پر کبھی نہ چلوں گا۔ اس راہِ خطرناک میں پھر قدم نہ دھروں گا۔

خوش طبعی

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے۔ البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیمِ الٰہی کی طرح کنایہ اور استعارہ سے بیان کروں، اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں، جو کہ نسب نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں۔
یہ واضح ہو کہ شیخ خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حُسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا۔ اس کا بیٹا حُسنِ بیان ہوا، اس نے اپنے ایک برابر کے خاندان میں شادی کی۔ اس کی دلھن کا نام خندہ جبین تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی۔
چنانچہ ان کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔ چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لبِ لباب تھا اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کی طبیعت بوقلمون اور گوناگوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں، اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے ہیں کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے۔
لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے، اس لیے کسی حالت میں ہو، اہل محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا۔ اسی کے ہمسایہ میں ایک مکر باز جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کو قائم مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد، ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آئیں،

میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے شخص سے ملیں تو اس کی اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ کے قبیلہ سے جا ملتا ہے یا نہیں۔ اور حقیقت میں وہ حسنِ ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھیں۔

ایک پہچان اس کی یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے، تو اسی کے قہقہے کان میں آتے ہیں اور گرد اس کے متین اور معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور جب ظرافتِ اصلی محفل آرا ہوتی ہے تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی ہوتی ہے، گرد اس کے سب ہنستے ہیں۔ بلکہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں کہ اگر اس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کسی کی بو نہ آئے، تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیہ سمجھنا چاہیے۔

جس بہروپیہ بھانڈ کا میں نے ذکر کیا وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے اور جھوٹ حقیقت میں ژٹل کا باپ تھا۔ ژٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا کہ اس کا نام سڑی مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک پھوڑ عورت تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی، جسے مسخرن دوانی کہتے تھے اس سے سڑی مستان نے شادی کی۔ ان دونو سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا جسے تم بہروپیہ بھانڈ سمجھتے ہو، بعض اشخاص کو بعض اوقات اس کے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بو آتی ہے، مگر وہ حقیقت میں ظرافت بد اصل ہے۔ اب میں ان دونو کا نسب نامہ لکھتا ہوں۔

جھوٹ	سچ
ژٹل	حسنِ ادب
سڑی مستان خاوند (مسخرن دوانی بی بی)	حسنِ بیان
ظرافت بد اصل یا نقلی	خوش طبعی (خاوند) خندہ جبینی بی بی)
یعنی بہروپیہ بھانڈ	ظرافتِ اصلی یا خوش طبعی

میں اس استعارہ کو زیادہ تفصیل دیتا اور ظرافت بداصل یعنی بہروپیے بھانڈ کی اولاد جو ریگِ بیابان سے بھی زیادہ ہے، سب کا حال نام بنام بیان کرتا، خصوصاً ان لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال حال لکھتا جن سے ملکِ وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے۔ مگر اس سے جا بجا حسد کی آگ بھڑک اٹھتی، اس لیے جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ظرافتِ اصلی اور ظرافتِ نقلی میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغا بازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے، اس قسم کے کام کرکے نہایت خوش ہوتا ہے۔ بلکہ دونوں باتیں اسے یکساں ہیں۔ خواہ خلعت پہنا دے، خواہ رُسوا کر دے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت و احترام بنا دے، ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے۔ کسی کی نافہمی و بدعقلی دکھا دے، کسی کی دانش و دانائی سُنا دے۔ ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھا دے، ابھی کنگال فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے، کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے، اسی کو کاٹ کھاتا ہے۔ اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اُڑاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے، اس لیے خوش طبعی کیے جاتا ہے۔ جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے، نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہیے اور جہاں ہونی چاہیے۔ چوتھے، چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے، اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں، چونکہ ہنسی چہل کے سوا اور کسی قابل نہیں اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے، اس لیے اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہے یعنی کسی صاحبِ معاملہ، یا صاحبِ تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے، نہ کہ فقط اس کی بُرائی یا اس کی تصنیف سے۔

نکتہ چینی

نکتہ چینِ ناانصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے

مصنف اپنی تصنیف میں یا تو نئے نئے مطالب اور تازہ مضامین سے دلوں کو شگفتہ کرتا ہے، یا مطالبِ معلوم کو بنا سنوار کر نئی آرایش زیبایش سے سامنے لاتا ہے۔ کبھی نئی روشنی کا جلوہ دے کر دیدۂ نظر باز کو عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے، کبھی دیکھی بھالی چیزوں کو نئے رنگ دے کر اور موقع و مقام بدل کر انھی میں تازگی و دل ربائی کے انداز پیدا کرتا ہے، بلکہ ایسے رنگ برنگ کے گل پھولوں سے سجاتا ہے کہ ہر چند ایک دفعہ طبیعت ان کی گلگشت کر چکی ہو، مگر خواہ مخواہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور جن چمنوں پر عقلِ سُبک سیر جلدی گزر گئی ہو، یا سرسری نظر کر گئی ہو، اُس کا دوبارہ دل میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ان محنتوں میں سے جس محنت کو دیکھو، مشکل سے مشکل ہے کیونکہ تصنیفِ مذکور کے مُفید اور کارآمد ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگوں کو اُن کی غلط فہمی یا عیب و صواب سے آگاہ کر دے، بلکہ ایک انداز برتنا چاہیے، جس سے ان کے دلوں میں اپنے رہنما یعنی مصنف کا اُنس اور اس کے کلام کا اشتیاق پیدا ہو۔ اور اس کے

سبب سے وہ اپنی ناواقفیت کا اقرار ہی نہ کریں، بلکہ ایک اس سے بھی کڑوا گھونٹ ہے' اُسے گوارا کریں۔ یعنی یہ بھی سمجھیں کہ یہ دل آگاہِ خیر خواہ ہم سے زیادہ تر دانا ہے۔

جو شخص مراتبِ مذکورۂ بالا پر نظر کرے گا، وہ خود سمجھ لے گا کہ ہر ایک بات ان میں سے پرلے سرے کی خطرناک اور نہایت جان کاہی کا کام ہے۔ پھر ایسا بے درد کینہ توز کون ہوگا کہ قارون بے چارہ جو خود عذابِ خدا کا مارا ہے' اس کے بوجھ میں پتھر بھر دے اور اسے ایک دل لگی سمجھے۔

کیسی بے درد کوششیں ہوں گی جو ایسے آرزومند دل کا توڑنا گوارا کریں کہ نہ اُن سے کسی شے کا طالب ہے' نہ اُن کے کام میں کچھ حارج ہے۔ فقط اتنی بات ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے۔ اسی کے لیے یہ سب تکلیفیں ہیں کہ وقتِ عزیز کو صرف کرتا ہے' آرام کو تکلیف سے بدلتا ہے، چراغوں کے دھوئیں کھاتا، دماغ کا عطر پیشانی سے ٹپکاتا ہے۔ اور ان سب منزلوں کا پہلا قدم یہ ہے کہ اکثر تو کامیابی کی جگہ ناکامی اٹھاتا ہے' اور کامیاب ہو تو فائدہ قلیل۔ یہ بے چارہ ان ساری مصیبتوں پر بھی صبر کرتا ہے اور اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔

ہاں، ایک نسل کے آدمی ایسے بھی ہیں کہ یا تو ایسی خلل اندازیوں کو فرضِ الٰہی سمجھے ہوئے ہیں' یا اپنے دل کا بہلاوا سمجھتے ہیں' جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کسی صاحب کمال کا جوہرِ قابل لوگوں کی نظر پڑ جائے۔ ہاں ہاں' یہ وہی لوگ ہیں کہ قلعۂ شہرت کے دروازے پر عصائے منصب داری لیے کھڑے ہیں اور فخر اپنا اس بات میں سمجھتے ہیں کہ جہالت اور عداوت جو چنگیز و ہلاکو کے تیر و تلوار لیے بیٹھے ہیں۔ یہ ان کے دربار میں سب سے پہلے عرض پہنچائیں کہ حضور کا شکار حاضر ہے۔

جو لوگ تصنیف کا ارادہ کریں، انھیں ابتدا میں اتنا ضرور چاہیے کہ جو اشخاص نکتہ چینی کے خطاب و القاب سے شہرہ آفاق بننا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں ایک سفارش کا بندوبست

کریں کیوں کہ اُن مردم آزاروں میں بڑے سے بڑا بے درد تھوڑا بہت نرم ہو سکتا ہے یا کچھ عرصہ کے لیے طبیعت کی نیش زنی کو چھوڑنا بھی گوارا کرسکتا ہے۔ میں نے اس تدبیر کی تلاش میں طبعِ سلیم کی طرف رجوع کی اور عہدِ قدیم کے بہت پرانے پرانے دفتر اُلٹے۔ آخر دیکھتے دیکھتے یہ معلوم ہوا کہ کالا ناگ راگ سے بربچ جاتا ہے اور بھونکتا کتا بھی ہڈی سے چپ ہو جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چین اگرچہ سانپ جتنے دانت بھی نہیں رکھتے، مگر اُس سے بھی سوا زہر اگلتے ہیں؛ اور کُتّے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے، مگر بھونکنے میں اس سے بھی کئی میدان پرے نکل جاتے ہیں۔

پس یقین ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ چند اشخاص کے باب میں میں نے سنا کہ بعض تو ایک گلاس شراب، اور ایک سیخ کباب پر راضی ہو گئے اور بعض اُن میں سے خوشامد کے راگوں کی چارتانیں سُن کر بے قابو ہو گئے۔

لیکن شوقِ ہمت نے بے ڈھب کام پر کمر باندھی ہے۔ اگرچہ عقل نصفتُ اندیش اُسے دلائلِ یقینی سے قائل کرتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ اس بد اندیش نسل کے حملہ ہائے متواتر سے ڈرنا چاہیے۔ مگر وہ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ اب تک صلح کی تدبیر یا راہِ گریز کا خیال بھی نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس مخالفت کا انھوں نے دعویٰ باندھا ہے، وہ انھیں قانونِ مصلحت کی رُو سے جائز نہیں بلکہ یہ ان کی جعلی حکومت ہے، جس کی نہ سند ہے، نہ شہادت اور اسی دعوے پر انھوں نے اسنادِ نکتہ چین کے خطاب سے حاکمِ دارالعدالت کی طرح فیصلے کیے ہیں۔ حق پوچھو تو مجھے یہ بھی صاف دھوکا نظر آتا ہے۔

داستان

حقیقتِ حال یہ ہے کہ نکتہ چینی جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلے کرنے کا اختیار پایا ہے، اصل میں خواجہ حق پرست اور محنت خاتون کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔

جب وہ پیدا ہوئی، تو پرورش کے لیے انصاف کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ اس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا۔ وہاں دن رات علوم کی جواہر کاری اور فنون کی مرصع نگاری کو دیکھا کرتی تھی اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں میں جی بہلایا کرتی جب بڑی ہوئی تو عالمِ بالا کے بزرگوں نے اُسے حسنِ کمال اور کمالِ حسن میں بے مثال دیکھ کر ملکِ خیال کا تاج سر پر رکھ دیا۔ کہ چند روز کے بعد مملکتِ خیال کی ملکہ ہو کر عالمِ بالا کی پریوں میں داخل ہو گئی۔ وہاں کی پریاں موسیقی، ناچ رنگ، سانگ، شاعری، افسانہ، تاریخ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں۔ چونکہ انھیں بھی ملکِ خیال سے تعلق تھا، اس لیے ملکہ نکتہ چینی نے اُن کے کلام میں بھی دخل پیدا کر لیا۔ جب انھوں نے عالمِ خاک کی طرف نزول کیا، تو ملکہ نکتہ چینی کہ خود فرمانروائے ملکِ خیال تھی، وہ بھی ان کے ساتھ روے زمین پر آئی۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے استاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دے دی تھی کہ اُسے تمغاے شاہی کی طرح ہر وقت اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے۔ عالمِ بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا جیتا کرتی تھی، تو اس مبارک باد میں اسے ایک ہار ملا کرتا تھا، جس میں گل ہاے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں۔ چنانچہ عصاے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طرّے سجا کر انھیں آبِ حیات کے چشمہ سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سروِ بے ثمر کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیے جاتے۔ یہ دریاے محویت کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں، جن سے افیون کا گھولوا اور پوست کا پانی ٹپکتا تھا۔ ملکۂ موصوفہ کے بائیں ہاتھ پر ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو، اس کی روشنی سارا حال جوں کا توں آئینہ کر دیتی تھی۔ بلکہ ہنر کی الجھاوٹ اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے الجھا دے، مشعلِ حق کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا حال بال بال روشن ہو جاتا تھا۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی

کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی، اور جن جن اینچ پیچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے، انھیں دفعتاً کھول دیتی تھی۔ بہتیرے زرق برق کے لباس کہ فصاحت اور عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، یہ ان کے بھی بخیے کھول دیتی تھی اور گھٹنت بڑھت کی پتلیاں جو بناوٹ کے کپڑے پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں، انھیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی۔

غرض کہ ملکہ موصوفہ ایسے ایسے شاہانہ سنگاروں سے سج کر آسمان سے نازل ہوئی تاکہ جو لوگ ان صاحبِ کمال پریوں کے دم بھرتے ہیں اور اعتقاد کا حق زبانِ قلم سے ادا کرتے ہیں، اُن کی جان کاہی اور محنتوں کی قدردانی کرے۔ چنانچہ جو کچھ اس کے سامنے پیش ہوتا تھا، اس پر مشعلِ حق کی روشنی سے نظر کرتی تھی اور جب سب طرح دیکھ بھال کر خاطر جمع کر لیتی تھی اور سمجھ لیتی تھی کہ اس تحریر میں قانون درستی پر کما حقہٗ عمل ہوا ہے، تو عصا کا آبِ حیات والا سر چھوا کر اجراے دوامی کا حکم چڑھا دیتی ہے۔ اس سے آبِ حیات کی شبنم برستی تھی اور تصنیفِ مذکور کو خاص و عام میں رواجِ دوام ہو جاتا تھا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو کتابیں اس کے سامنے پیش ہوئیں، ان میں دیکھا کہ بہت سے مضامین بے اصل ہیں بلکہ دغل فصل کے مطالب خرچ ہوئے ہیں۔ البتہ محنت نے ان پر جھوٹ موٹ کے رنگ روغن چڑھا کر رنگ آمیزی کی ہے۔ مگر پھر بھی الفاظ اور مطالب ٹھیک مطابق نہیں بیٹھے یا فکرِ صحیح نے مطلبِ اصلی سے درست جوڑ نہیں دکھایا، یا کچھ کچھ واہیات زٹلیں، احمقوں کے خوش کرنے کو لکھ دی ہیں، یا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے بے فائدہ مطالب درج کر دیے ہیں کہ نہ اُن میں لطفِ مضامین ہے، نہ بات کی پختگی ہے، نہ کچھ زیادہ فائدہ مند ہے۔ غرض جہاں کوئی بات کھٹکتی تھی (اور ایسی چوک اس پر کھل جاتی ہی تھی) پس وہاں ملکہ نکتہ چینی اس سرے کے چھوانے سے انکار کرتی تھی جس سے تصنیفِ مذکور کے رواج کو استقلال دوام ہو جائے۔ مگر جس میں بہت موٹی موٹی غلطیاں دیکھیں، تو اُسے عصا کے دوسرے سرے سے

ٹھکرا کے ہٹا دیا۔ یہ پوست کے ڈوڈے اور سرو کے پتے ایسا زہر بہاتے تھے کہ اسی وقت سے کتابِ مذکور آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی تھی۔ اور جس طرح کوئی افیونی نشہ کے رنگ میں اونگتے اونگتے تحت الثریٰ پہنچ جائے، اسی طرح تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل نیست و نابود ہو جاتی تھی۔ چند روز کے بعد کسی کو خبر بھی نہیں رہتی تھی کہ کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ کئی کتابیں ایسی بھی نکلیں کہ انھیں دیکھ کر ملکہ متردّد ہوئی اور اپنی چھڑی کو جو درحقیقت عدل کی ترازو تھی، بیچوں بیچ سے پکڑے کھڑی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ایسی کتابیں اس کثرت سے جمع ہو گئیں کہ ملکہ ان کے مشکوک دعووں اور بے جا سفارشوں پر توجہ کرتے کرتے تھک گئی۔ آخر بنظرِ احتیاط کہ مبادا انصاف کی چھڑی بے جا کام میں آئے، اُن کے مقدمہ کو وقت کے حوالے کر دیا کہ وہ خود بخود ان کے بُرے بھلے کی حقیقت کھول دے گا۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ تصانیفِ مذکورہ دعووں کے زور اور سفارشوں کی قوت سے چار دن کی چاندنی کی طرح چند روز رہیں گی، مگر ایک زمانہ کے بعد خود بخود سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کتنا اندھیرا ہے، کتنا اُجالا ہے۔

وقت کے کاروبار سُست تو تھے اور شروع میں کچھ باتیں واہیات بھی معلوم ہوتی تھیں، مگر اور سب باتوں میں اس کی رائے بالکل انصاف سے متفق ہوئی۔ بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ اُن کی تصنیفات پر جو چھڑی کے چُھوانے میں کچھ توقف ہوا، تو اس سے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہم بالکل کامیاب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کتابیں بغل میں مارے رواجِ دوام کے یقین میں خوشی خوشی زمانِ آیندہ کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ مگر زمانہ گزران کی درانتی کے نیچے انھیں بھی گھِسا کھانا پڑا اور ایک زمانۂ معہود کے بعد خود بخود کٹ کر گر پڑے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض تصنیفات تو آہستہ آہستہ کٹ کر برباد ہوئیں اور بعض ایک ہی رگڑے میں دو ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئیں۔

ملکۂ نکتہ چینی بہت دیر تک وقت کے عمل درآمد کو دیکھتی رہی اور آخر کار اس کے کاروبار سے مطمئن ہو کر اپنے استاد خداوند انصاف کے ساتھ دنیا سے چلی گئی۔ مگر یہ

غضب ہوا کہ غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کو عداوت، دغا اور خرابی کی رفاقت میں کھلا چھوڑ گئی کہ جس کی محنت اور جانکاہی کو چاہیں، بے دھڑک برباد کیا کریں۔ بلکہ اب تو ملکہ نے اتنی ہی بات پر اکتفا کیا ہے کہ وہ دور سے بیٹھی تماشا دیکھا کرتی ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو دل علم کے فیض اور نیکی کے نور سے اثر پذیر ہیں، ان تک اپنا فیض پہنچاتی ہے۔

اکثر نالائقوں کی بدتمیزی کے سبب سے ملکہ چلتے وقت غصہ بھی ہوئی تھی اور اپنے عصا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اچھال دیا تھا چنانچہ آبِ حیات والا ٹکڑا تو خوشامد اور چاپلوسی نے اُچک لیا تھا اور دوسرا سرا جو آبِ محویت سے آلودہ ہو رہا تھا، وہ عداوت نے لپک لیا تھا۔ چاپلوسی جب آبِ حیات والا سرا ہاتھ آیا تھا، اس کے مرید اور غلام بہت موجود تھے، مگر ان کے پاس نہ تو روشنی موجود، نہ وہ روشنی چاہتے تھے، اسی واسطے اچھے بُرے کا خیال نہ کیا۔ کبھی تو زبردست کے دباؤ سے، کبھی دنیا کی طمع سے، کبھی لطفِ طبع کے لیے جو کچھ کوئی پیش کرتا اسے آبِ حیات والا سرا چھوا دیتے۔ ادھر عداوت کی چغل خوروں سے بڑی راہ تھی۔ انھوں نے اسے ایک لالٹین تیار کر دی۔ مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ روشنی اس کی ایک رخی تھی، یعنی فقط برائیوں پر ہی پڑتی تھی، خوبیاں بالکل نظر نہ آتی تھیں ؎

دشمنانِ تیرہ دل کی تیرگی کو کیا لکھوں

جس قدر دیکھو سوا، اتنا سوا اندھیر ہے

غرض چاپلوسی اور عداوت دونوں کے مُرید اپنے اپنے سونٹے کے زور پر اپنی اپنی ملکہ کے اجرائے احکام کے لیے عالم میں پھیل گئے کہ جسے چاہیں، عمرِ دوام بخشیں، اور جسے چاہیں ایک دم میں فنا کر دیں۔ مگر اب اس ٹوٹی پھوٹی چھڑی کی بھی طاقت بالکل جاتی رہی ہے۔ وقت ان کے فیصلے کا ذرا لحاظ نہیں کرتا، جو چاہتا ہے، بے لاگ حکم چڑھا دیتا ہے، اور وہی تمام عالم میں جاری ہو جاتا ہے۔ آؤ میرے دوستو! اُسی کی راہِ انتظار پر بیٹھ جاؤ۔

مرقع خوش بیانی

خوش بیانی کا مُرقع اور فصاحت اصلی و نقلی کی جنگ

جس شغل میں مدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو، اُس سے بالکل دل کا اٹھا لینا بہت دشوار ہے ہر چند دل کو اس کی یاد سے حرکت نہ دیں، مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں، جیسے سمندر میں مد و جزر آکر ٹھیر جاتا ہے اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں، مگر پانی گھر یوں پڑا لہرایا کرتا ہے۔ اسی طرح آج مجھے خیال ہوا، یعنی پچھلی رات باقی تھی جو بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔

اس عالم خواب میں خوش بیانی کا ایک مرقع مسلسل مری آنکھوں کے سامنے سے گذرا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوش بیانی اصلی تھی یا نقلی، یا دونوں سے مرکب تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوا گویا مجھے ایسی سرزمین میں لے گیا ہے، جو دنیا کے عجائب و غرائب سے مالا مال، بلکہ سحر کاری اور نیرنگ سازی سے بھری ہوئی ہے اس ملک میں ایک ملکہ کی حکمرانی تھی، جسے وہاں کے لوگ ملکۂ سخن آرا سمجھتے تھے۔ مگر دنیا کے لوگ خوش بیانی بے معنی مشہور کرتے تھے۔ دیکھتا ہوں کہ باغ سے شہر اور شہر سے اُجاڑ تک، بلکہ کھیت سے جنگل اور جنگل سے پہاڑ تک، کوئی شے ایسی نظر نہیں آتی، جو ذرا اصلیت کا رنگ رکھتی ہو۔ بعضے درختوں پر سونے روپے کے پتے لہلہاتے تھے۔ بعضوں پر تناشش تمامی کے پھول جگمگاتے تھے۔ ٹہنیوں میں گوہر یکتا اور جوہر بے بہا آویزاں تھے۔ فواروں میں کیوڑا اور بید مشک پڑا اچھلتا تھا اور اس کی دھاروں میں

سُریلی آوازیں لہراتی تھیں۔ جنگل کی گود کے پالے، ہرنیاں اور پاڑھے صحرا کے دامن میں لوٹ رہے تھے۔ دریا کے پیارے یعنی آبی جانور اور رنگین زنگین مچھلیوں کے لچھے نہروں میں جھلملا رہے تھے۔ پرندے بھی بے شمار تھے، مگر اکثروں کی چونچیں سنہری تھیں، اکثروں کے بازو ہیرے اور یاقوت سے تراشے تھے۔ اس پر نغمہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے شعرا کی غزل خوانی کا دم بند ہوتا تھا۔ پھولوں نے ہوا کو عنبر و لوبان، مشک و زعفران سے بسا رکھا تھا۔ عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں۔ اور یہ ملی جلی خوشبوئیاں الگ الگ ایسی کیفیتیں دیتی تھیں گویا روشِ ہوا پر گل کاری کے تختے کھلے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے صبا و نسیم کے دامن عاشقانِ مہجور کی آہوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو موجِ ہوا تھی، حسرت زدوں کے پیاموں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

میں اس دشتِ سحر نگار میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر اُن عجائبات کو دیکھ کر مجھ سے بولے بغیر نہ رہا گیا، اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا۔ مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو میری آواز گونج کر پلٹتی تھی، وہی میری باتوں کا جواب ہوتی تھی۔ باوجود اس کے کبھی اتفاق کرتی تھی، کبھی تردید کرتی۔ غرض اَن دیکھے ہمراہیوں کے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا، جو ایک غار کے سرے پر پہنچا۔ دیکھوں، تو اندھیرا گھپ ہے۔ آگے بڑھا تو ذرا آنکھیں روشن ہوئیں اور معلوم ہوا کہ ایک عمارت عالی شان بنی ہوئی ہے۔ اس کے دروازہ پر جو اشعار سونے کے حرفوں سے لکھے ہوئے تھے، اُن سے معلوم ہوا کہ یہ خیال پرستوں کا مندر ہے، اور ایک دیوتا مہاراج اس کے دروازے پر بیٹھے ہیں کہ عالمِ حماقت کے فرمانروا ہیں۔ سر پر دستار سرگردانی ہے اور تاج کی جگہ ایک سردِ سر پر باندھ لیا ہے۔ قلندرانہ لباس پہنے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب لیے ہیں، دوسرے میں جُھنجُھنا ہلاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف محنت بیٹھی عرق ریزی کر رہی ہے اور آگے چراغ جل رہا ہے۔ بائیں ہاتھ پر تلون مزاجی کھڑی ہر دم نیا رنگ بدل رہی ہے؛ کندھے پر ایک عجیب الحرکات یعنی بندر بیٹھا اچھل رہا ہے۔ وہ کبھی جھک جھک کر سلام کرتا ہے، کبھی منہ چڑانے

لگتا ہے، کبھی ٹہنیاں ہلانے لگتا ہے۔ اس کے پیش قدم بھینٹ چڑھانے کی جگہ عجیب ڈھنگ کی بنائی تھی۔ اور پیچھے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت وہ ایسی ہی تھی، جیسا کہ اس کے گرد لکھا ہوا تھا۔ بہت سی بھینٹ اور قربانیاں وہاں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر صورت ہائے بے معنی کے جانور وہاں لٹکتے تھے، جن کا نام ان کے معتقدوں نے نازک خیالی اور رنگین بیانی رکھا تھا۔ یہ جانور حروف بے آواز اور آوازِ بے حروف کے زمزمے بھرتے تھے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سراسر مضمون، مدعا غائب۔ بہت سی متشابہ صورت کی طوطیاں اور غلط نما بلبلیں تھیں کہ کبھی نظر آتی تھیں، کبھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اکثر نیم بسمل پڑے تڑپتے تھے۔ معلوم ہوا کہ تشبیہوں اور استعاروں کا گنج شہیداں یہی ہے۔ وہیں ایک مجلس نظر آئی کہ جس کے اہلِ محفل میں کسی کی ایک آنکھ کسی کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں، اور جو بھینگے نہ تھے، وہ طاقی تھے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے تجنیس اور ایہام وغیرہ صنعتوں پر اپنی آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ ایک طرف زمینِ شعر میں درخت بنا کر کھڑے کر دیے تھے، مگر ثمر اصلا نہیں تھا اور ثمر تھا، تو مزہ ذرا نہ تھا۔ یہ مندر اُن کے پجاریوں اور جھنتوں سے بھرا ہوا تھا، جن کی آنکھیں تو بند نہیں مگر وہم و وسواس انگلی پکڑے انھیں لیے پھرتے تھے، اور جن شغلوں میں لگا دیتے تھے، انھی میں لگ جاتے تھے۔ ایک طرف ایک پلٹن تھی، فقط ہیرے پھیرے کرتی پھرتی تھی؛ اس کا نام قواعد رکھا تھا۔ کبھی ننگے سر ہو جاتے تھے، کبھی ایک ننگے سر اور ایک ننگے پاؤں[1] ہو کر گنڈے دار ہو جاتے تھے۔ کبھی اکہرے ہو جاتے تھے، کبھی دوہرے ہو جاتے تھے، کبھی سب باہم گلے میں ہاتھ ڈال کر لوٹ جاتے تھے۔ اضطراب اور گھبراہٹ نے ایک غلط ملط کتاب بنا کر اُن کے ہاتھ میں دے دی تھی؛ اسی کے بموجب اُن کی قواعد تھی۔

---

[1] یعنی بے نقط یا منقوط، یا فقط اوپر ہی نقطے ہوں، یا نیچے ہی نقطے ہوں، یا حروف اس کے ایک ایک الگ الگ تحریر ہوں، یا سب کے سب ملا کر لکھے جا سکتے ہوں۔

آگے دیکھتا ہوں کہ ایک مجمع ایسا کھڑا ہے گویا دربار کو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ننگا آدمی آیا اور برابر سب کی پگڑیاں اُتارتا چلا گیا کہ اپنے لیے کپڑے بنائے۔ معلوم یہ ہوا کہ کوئی شاعر ہے کہ توشیح کا عمل کر کے کسی بادشاہ کا نام نکال رہا ہے۔ اُن سے آگے اور بھی اعلیٰ درجے کے لوگ نظر آئے۔ دیکھتا ہوں کہ بہت سی کرسیاں بچھی ہیں۔ ان پر کچھ اشخاص کھڑے ہیں، کسی کے ہاتھ میں ایک ریت گھڑی ہے کہ وقت کا اندازہ بتائے۔ کسی نے ایک دائرہ کھینچ کر ہاتھ میں لے لیا ہے اور منہ سے نفیری بجا رہا ہے۔ مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر کا بیاہ ہوا ہے اور ایک کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اُن کی تاریخیں کہہ رہے ہیں۔ اور ایک طرف دیکھتا ہوں کہ دو رُخے انسان بیٹھے ہیں، مگر منہ سے کچھ نہیں بولتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسے فقرے اور شعر ہیں جو اُلٹے سیدھے دونو طرف سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر لطفِ معنی ندارد۔

مندر کی مغربی جانب میں دیکھا کہ چند اشخاص نہایت محنت کے کام میں مصروف ہیں اور بہت سے ڈھیر ان کے آگے پیچھے پڑے ہیں۔ اُن سے میں نے پوچھا کہ صاحب کیا کر رہے ہو؟ بولے کہ معموں کا ذخیرہ تیار کر رہے ہیں کیونکہ دیوتا کو اس سے زیادہ کوئی بھینٹ نہیں بھاتی۔ ان ڈھیروں میں ایسی طرح بہ طرح کی چیزیں تھیں کہ ایک کو دوسری سے نسبت نہ تھی۔ بہت سی گڈیاں بھی بندھی تھیں اور لکڑی کے انبار کی طرح اوپر تلے پڑی تھیں۔ انہی میں ایک جگہ لنگر لنگوٹے، ایک طرف جُبّے اور عمامے، پھر انھیں میں پشوازا اور پاؤں کے گھنگرو چھوٹی بڑی تھیلیوں اور پوٹلیوں میں بندھے آٹم لگے ہوئے تھے۔ ایک گٹھڑی میں سے ایک کاٹ کے گھوڑے کا سر بھی نکلا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گھبرا کر چلا۔ اتنے میں ایک کاری گر نے مجھے متحیر دیکھ کر پکارا کہ جناب ایک ایک پوٹلی میں گنج کے گنج نازک خیالیاں ہیں۔ اگر آپ کہیں تو دکھاؤں۔ میں نے سلام کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معاف کیجیے، اس وقت مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔

میں مندر سے باہر جاتا تھا، جو دیکھا کہ بہت سے آدمی آگے پیچھے بے ترتیب ایک جگہ جمع ہیں۔ مگر آمنے سامنے بیٹھے پٹاپٹ قافیہ بازی کر رہے ہیں۔ اپنی تک بندی پر آپ ہی آپ خوش ہوتے ہیں اور تفاخر کی ٹوپیاں اچھالتے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ہی تھا، جو دیکھا کہ آگے دوہری دوہری، تہری تہری تک بندیاں ہو رہی ہیں۔ انھیں سُن کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اُن کے پاس ہی دیکھا کہ بہت سی خندہ جبیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، مگر جسے دیکھتے ہیں، اسے کوئی اور شخص سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں، اور ایسی مسخراپن کی غلطیاں کرنے کے لیے جوڑی جوڑی ہو گئے ہیں۔ ہر جوڑی سر سے پاؤں تک ایک ہی لباس پہنے ہے، مگر اصل میں ایک کو دوسرے سے مناسبت بھی نہیں۔ کبھی کسی بوڑھے پرانے کو لڑکا فرض کر لیتے ہیں۔ کبھی مرد کو عورت سمجھ لیتے ہیں۔ کبھی حبشی کی جگہ فرنگی بٹھا لیتے ہیں۔ اور اس پر آپ ہی آپ خوش ہو کر واہ وا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مبتذوں کا جمگھٹ ہے۔

جب ان طلسمات کو دیکھتے دیکھتے میرا سر پھر گیا، تو گھبرا کر وہاں سے نکلا۔ باہر دو چار کھیت آگے بڑھا تھا، جو دفعتہً ایک ہیبت ناک غل اور ساتھ ہی طبلِ جنگ کی آواز آئی اور ایسا معلوم ہوا، گویا کوئی فوج جنگی چڑھی چلی آتی ہے۔ آخر جو میں نے قیاس کیا تھا، وہی نکلا۔ یعنی دور سے ایک روشنی کا غبار نمودار ہوا۔ اس کے درمیان ایک مرد با وفا صاحبِ شکوہ، سر پر اعزاز کا تاج رکھے گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ جو اُسے دیکھتا تھا کہتا تھا کہ سچ ہے اور برحق ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اس کا فرزندِ دلبند خراماں خراماں آتا تھا۔ پشت پر بہت سے ترکش لٹکتے تھے۔ ہاتھ میں چڑھی کمان اور کمان میں تیر جوڑا ہوا تھا۔ اُس کا نام حسنِ بیان تھا۔ جوں ہی ان دونوں کے آنے کی خبر اُڑی، ظرافت بے معنی کے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ عالمِ حماقت کے دیوتا یعنی ادت دہا بھوت بذاتِ خود اپنی ایک کالی گھٹا کے رنگ میں فوج لے کر اٹھے۔ بادل کی طرح گرجتے، اور مینہ کی طرح برستے، سر پر آ موجود ہوئے۔ اور جن جن نامعقولوں

کو میں نے مندر میں دیکھا تھا، وہ انبوہِ بے تمیزی اندھیری رات کی طرح ایک لشکر کی صورت میں نمودار ہوئے، اور جھٹ صفیں باندھ لیں کہ دشمن کا آگا روکیں۔ جو جو معتقد جان نثار تھے، انھیں حکم پہنچا کہ گھوڑے اُڑا اُڑا کر سامنے اُچھلو اور لغات کی لفّاظی اور مبالغوں کی دھوم دھام سے غل مچاؤ کہ حریف سنتے ہی ڈر کر بھاگ جائے۔ چونکہ حریف بہت آہستہ آہستہ کوچ کر رہا تھا، اس لیے یہاں کے سرحدی لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ بھیڑ اکٹھی کر کے الگ کھڑے ہو جائیں اور اُس وقت کے منتظر رہیں کہ اخیر کو میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

شائقینِ سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانیِ مرکّب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا یعنی کچھ اصل کچھ بد اصل۔ چنانچہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی، مردوں کے جسموں میں برچھیاں چبھی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے، تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں۔ غرض کہ جیسے عجائب و غرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا، اُس حالت کی زنگارنگی بیان کے احاطہ میں محصور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا، دفعتاً ان میں ایک ہل چل مچی، اور فوراً دو حصّہ ہو کر ایک حصّہ سچ کے سایۂ علم میں جا کھڑا ہوا، دوسرا اوت وہابھوت یعنی جھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہو گیا۔ دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لیے چند قدم آگے بڑھے۔ مگر جوں ہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی، وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا۔ آخر ادھر سے سچ بھی آگے بڑھا۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو روسیاہ نیست و نابود ہو گیا اور جہاں کالا پہاڑ تھا، وہاں خاک سی اُڑ کر رہ گئی۔ تم نے آفتاب کو دیکھا ہوگا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے، چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ

اُن کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کرّہ سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ یعنی اودت ہا بھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے اور نہ فقط دیو دروغ بلکہ سارا لشکرِ شیطان جو ہمدردی اور جان نثاری کو حاضر تھا، دم کے دم میں ہوا ہو گیا۔ طلسمِ باطل کا مندر زمین میں غرق ہو گیا۔ مچھلیاں دریاؤں میں چلی گئیں۔ پرندے چڑیوں کی طرح اُڑ گئے۔ جنگلی حیوان جنگل میں چلے گئے۔ اور اب زمانہ نے نئے سرے سے اصلی رنگ بدلا یعنی چشموں کی روانی، مرغانِ خوش الحان کے چہچہے، پھولوں کی خوشبویاں، روے زمین کی سرسبزی نے سچا رنگ نکالا۔ اگرچہ میں ابھی پڑا سوتا تھا، مگر اس عالم میں ایسا معلوم ہوا کہ اب خوابِ غفلت سے میری آنکھ کھل گئی اور ان طلسمی عجائب و غرائب کی جگہ پر سرسبز جنگل، اصلی نہریں، ہری بھری کیاریاں ہو گئی ہیں۔

جن شعبدوں کے اچنبھے نے میری عقل و حواس کو درہم برہم کر دیا تھا، جب وہ سامنے سے دور ہوا، تو میں نے خوش بیانی اور صداقت کے جلوہ کو نظرِ غور سے مشاہدہ کیا، کیونکہ انسان ایک چیز سے نظر اٹھائے بغیر دوسری چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ ان کے بعد مجھے ایک انبوہ نظر آیا، جن میں شاہنامہ کی بحرِ متقارب فردوس کے پھولوں کا تاج سر پر رکھے شمشیرِ برہنہ علَم کیے کھڑی تھی۔ خاقانی قصائد کے تاتار میں خاقانِ چین بنا ہوا تھا۔ پہلو میں انوری اور ظہیر و جامی مضامین سے نور اُڑا رہے تھے۔ خاص خاص قسم کی مثنویاں، غزلیں اور رباعیاں اپنے اپنے درجہ سے اس کے دائیں بائیں اور پس و پیش آراستہ تھیں۔ نثر اپنے پیادوں کی صفیں باندھ رہی تھی۔ مرثیوں کی نظم و نثر غمناک سنبل سے بال بکھیرے، جامۂ خون آلود پہنے خاموش کھڑی تھی۔ ہجو کے ہونٹوں پر تبسم تھا، مگر خنجر زیرِ قبا لیے کھڑی تھی کہ جدھر موقع پاؤں گی، ہرگز نہ چوکوں گی۔ فصاحت کا علَمِ نصرت بلند تھا اور اس سے پہچانا جاتا تھا کہ بجائے پھریرے کے اس پر بجلی کوند رہی تھی۔ اس سارے مرقع کے پیچھے لطائف و ظرائف بھی نسیم و صبا کی طرح خراماں خراماں پھر رہے تھے، اور در حقیقت مہم کے شروع

ہونے سے پہلے انھیں یہاں جمایا تھا کہ ایسا نہ ہو، دشمن سے جا ملیں کیونکہ وہ دلوں سے ایک نگاہ ادھر بھی رکھتے تھے۔ انھیں کے پہلو میں مشاعرہ کا جلسہ تھا اور حافظ اور سعدی کی غزلوں سے شرابِ شیرازی کا دَور چل رہا تھا۔ سلطانِ خوش بیان کے ظہور سے میرے دل پر ایک ہیبت طاری ہوئی، مگر ساتھ ہی خوشی کا بھی اثر ہوا۔ اس کی نگاہ مومنی تھی کہ دل سے پیار آتا تھا، مگر ساتھ ہی ایسی تیز بھی کہ دل کانپا جاتا تھا۔ میں اس کی طرف نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنے تیروں کا ترکش لے کر مجھے دینے کا اشارہ کیا۔ میں نہایت خوش ہوا اور اس کے لینے کے لیے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ مگر ہاتھ جو کرسی سے ٹکرایا تو دفعتہً آنکھ کھل گئی۔

سیرِ عدم

مسافرانِ عدم کے پسماندوں کی سرگزشت

جب کوئی نہایت چاہیتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی تو کیا دل بے قرار ہوتا ہے اور جان صحرائے تصوریں کیسی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے، مگر جب تھک کرنا چار ہو جاتی ہے، تو اداس بے آس ہو کر آتی ہے اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے۔ عقل و فہم البتہ دلِ غم گین کو سہارا دے سکتے ہیں۔ مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا اور جو غذا اس کے جی کو بھاتی ہے، اسی کو ڈھونڈتا ہے۔ درحقیقت یاد جو دل کی ہمسائی ہے، وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے، اور ایامِ گذشتہ میں جو مزے اٹھائے ہیں، یا دولت کھو کر عیش اُڑائے ہیں، اُن کی گذری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے۔ کسی کو اس دولت و عظمت کا غبار اُڑتا دکھائی دیتا ہے، جس کی سواری گذر گئی۔ کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سُناتی ہے، جو شہرِ خموشاں میں پڑے سوتے ہیں۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور ان کی طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے، کبھی پیاروں کے پیار اور ان کی محبتوں کے افسانے سُناتی ہے۔ دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے، وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھیلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مگر زمانہ اور اس

وقت کا گذر جانا حالتِ مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے۔ ساتھ اس کے یا تو عقل وفہم آکر حسرت و اشتیاق کو دباتے ہیں یا کوئی اور باہر کا شوق اُن سے بھی زبردست آتا ہے؛ وہ اُن کا زور گھٹاتا ہے۔

میں انھیں خیالات میں پڑا تھا، جو نیند آگئی۔ دیکھتا ہوں کہ گویا ایک چٹیل میدان، صحرائے بیابان سمندر کا کنارہ ہے اور میں وہاں بہت سے لوگوں میں کھڑا ہوں کہ جن کے سوگوار چہرے اُن کے دل کے غم و اندوہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو دریا بہہ رہا تھا، اس کا چپ چاپ بہاؤ اور سنّاٹے کا چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتا نہیں۔ اس دریا کو دریائے اشک کہتے ہیں۔ اُسی دریا میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر پار جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں بیٹھ بیٹھ کر اُسے خراب کر دیا ہے۔ مصیبت اس کشتی پر ملّاحی کرتی تھی۔ چنانچہ وہ اسے فوراً ہمارے پاس لے آئی۔ ہم بھی سوار ہونے کو تیار ہی تھے کہ اتنے میں ایک بی بی دیرینہ سال شرم و حیا کا برقعہ اوڑھے، حلم کی لاٹھی ٹیکتی، آئی۔ شفقتِ مادرانہ سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا اور سفرِ دریا کے خطر بیان کرنے لگی، تاکہ ہم کسی طرح سے اپنے ارادہ سے باز رہیں۔ اکثر لوگوں نے اُسے پہچان لیا کہ بی بی صابرہ خاتون ہیں۔ چنانچہ بعض اشخاص جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے، انھوں نے اس کا کہا مانا اور پیچھے ہٹ آئے۔ باقی ہم نہیں سے سوار ہوئے۔ بڑھیا بے چاری کی نیک ذاتی اور اُس کے دل کی خیرخواہی نے مصیبت زدوں کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور کہا کہ اے فرزندو! اگر تم کہو تو میں بھی تمھارے ساتھ سوار ہو لوں کہ بھلا اگر سفر میں وقت پڑے تو تمھیں تسکین یا اصلاح مناسب تو دے سکوں۔

غرض ہم کشتی میں سوار ہو کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کشتی چل نکلی اور بادبان

کھل گئے۔ مگر ان بادبانوں میں فقط آہوں کا دھواں بھرا تھا کیونکہ اس ملک کی ہوا یہی تھی۔ رستہ میں اگرچہ بہت سے صدمے اور تھپیڑے اٹھائے، مگر اکثر لوگ ہم میں سے ایسے تھے کہ انھیں اس کی پروا بھی نہ تھی۔ غرض بہزار دقت کشتی کنارہ پر لگی۔ جب پار اترے تو دیکھا کہ ایک جزیرہ ہے۔ مگر وہاں ایسی دھند چھائی ہوئی تھی کہ سورج نے اپنی شعاعوں کے ہزاروں تیر مارے، ایک پار نہ جا سکا۔ سامنے ایک بھیانک اندھیرا اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ جو لوگ ہم میں ذرا دلوں کے نرم تھے، وہ تو اس مقام کو دیکھ کر سخت گھبرائے اور ناچار ہو کر صبر کے دامن کو ہاتھ لگایا۔ چنانچہ اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا اور وہ ہیں وہیں چھوڑ کر اُدھر اتر گئے۔ پھر یہ بھی ہم نے سُنا کہ اس کے پتے کے بموجب جزیرہ کی سرحد پر پہنچ کر انھیں ایک پایاب مقام ہاتھ آگیا۔ میں ابھی تک انھیں لوگوں کے ساتھ تھا، جن کا یہ ارادہ تھا کہ جزیرہ کے بیچوں بیچ ہی میں جا کر دم لیں گے۔ چنانچہ وہ سب نہایت آہستگی اور سنجیدگی سے جیسے کوئی جنازہ کو لیے جاتا ہے، چلے جاتے تھے۔ انہی ہم سفروں کے حلقۂ رفاقت میں میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک سرسبز بن میں جھاڑیوں کے اندر اندر چلے جاتے ہیں اور اُن درختوں کو قبرستان پر ہی سایہ کرنے کا عشق ہے۔ یہاں کچھ آدمی بھی رہتے معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی نالہ وزاری میں مصروف تھے کہ کسی طرح انھیں تسکین نہ ہوتی تھی۔ کوئی شاخِ درخت کو پکڑے کھڑا تھا اور زار زار روتا تھا۔ کوئی اپنے ہاتھ کو مروڑتا تھا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ کوئی چھاتی پیٹتا تھا، اور بال نوچتا تھا۔ کوئی خاموش تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا صدمۂ غم سے سکتہ کا عالم ہو گیا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر اور آوازوں کو سُن کر ہمارا غم اور بھی زیادہ ہوا۔ بلکہ ایک رفیق تو ایسا بے تاب ہوا کہ رستہ پر ایک درخت کا ٹہنا جھکا ہوا تھا، اس نے ارادہ کیا کہ اس میں لٹک کر رہ جائے، مگر ساتھیوں نے تسلی دلاسا دے کر سنبھالا۔

اب ہم چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے کہ زمین آسمان اندھیرا اور بالکل سنسان مقام تھا۔ جنگل کی سائیں سائیں، ٹھنی ٹھنی سے رونے کی آواز، ہوا کا گھٹاؤ، دلوں کے دھڑکنے سے جب ہمارا حال بہت ابتر ہوا، تو سب کو یقین ہو گیا کہ اب ہم کنج غم کے پاس آپہنچے۔ وہ ایک گہری گھاٹی کے بیچ میں اندھیرا گھپ ایک لمبا غار تھا۔ اسی کے رستوں کے ایچ پیچ میں کچھ کچھ پانی بھر رہا تھا، مگر عجب رنگت پائی تھی کہ نہ کالی' نہ لالی' وہی نیلا پیلا کیچڑ پانی تھا کہ نالہ وزاری کی آوازوں پر آہستہ آہستہ سرکتا تھا اور مارے غم کے دل کو لہو پانی کر کے بہاتا تھا۔ غارِ مذکور کے اندر ایک نہ خانہ تھا جس کے دروازہ پر آہ کے قلم اور تیرہ بختی کی سیاہی سے لکھا تھا کہ کلبۂ احزان کا دہانِ غم یہی ہے۔ اندر اس غارِ مصیبت کے دیوغم انجام کا وجود بدنمود نظر آتا تھا۔ اس کے رستے میں کوڑا' کانٹے اور سانپ بچھوؤں کے ڈنک بکھرے ہوئے تھے۔ جس تخت پر اس کا جلوس حاکمانہ تھا، وہ ایک ٹوٹی پھوٹی پہاڑی کی چٹان تھی۔ تکیوں کی جگہ پیچھے اور پہلوؤں میں کئی کڈھنگے بے ڈھنگے پتھر ڈال دیتے تھے۔ سر پر تاجِ بے کلاہی دھرا تھا، جس پر اندھا دھند اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بارِ غم کے مارے سر کو بازو پر سہارا دیے ہوئے تھا۔ اس شان سے اپنی غم پرست و غم آئین رعایا پر حکمرانی کرتا تھا، اور افسردہ پژمردہ، چپ چاپ' خاموش' خود اپنے خیال میں گم ہو کر حماقت کی تصویر بن گیا تھا۔

اس کے ایک طرف ملامت وافسردگی کھڑی تھیں کہ مارے ضعف کے جھکتے جھکتے نقشِ زمین ہو گئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ غش آ گیا۔ دوسری طرف فکر تھا کہ دم بدم کی سرگوشی سے ہزاروں وہم ووسواس کے عذاب میں گرفتار تھا۔ زردی سر پر کھڑی رومال ہلاتی تھی کہ رنگ دھواں ہو کر اڑے جاتے تھے۔ پہلو میں درد بیٹھا تھا کہ جونک کی طرح اندر لہو پیے جاتا تھا۔ تمام غم خانہ میں ویرانی و بربادی چھائی ہوئی

تھی اور اس کھنڈر کے چھیدوں میں کئی چراغِ سحری بھی ٹمٹما رہے تھے، جن کے نیلے نیلے شعلے اُٹھتے تھے اور اپنی ہی بلاہٹ میں میٹھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ وہ غم کی حالتِ اصلی کو اور بھی زیادہ خوف سے روشن کرتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اکثر لوگ رستہ کے دھکوں کے مارے جاتے ہی گر پڑے۔ چنانچہ جو ظالم ستم گار تخت کے آس پاس کھڑے تھے، اُن کے حوالے ہو گئے۔ بعض خوش نصیب تھے کہ رنج و عذاب سہتے سہتے دروازے کی طرف بھاگے۔ وہاں بی بی صابرہ خاتون اُن کے استقبال کے لیے منتظر کھڑی تھیں کیونکہ جب ہم اندر گئے، تو اس بچاری کو وہاں چھوڑ گئے تھے۔ اس کی رفاقت ایسے وقت میں نہایت غنیمت معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہمیں اس کلبۂ احزان کے گرد ایک چکر دیا۔ جب پچھواڑے کی طرف آئے، تو ایک بلندی نظر آئی۔ اس پر چڑھ کر دفعتہً معلوم ہوا کہ گویا ہم اس ماتم درہ کے نکاس کی راہ پر آ گئے۔ اس بلندی پر اس نے کہا کہ فرزندو! یہاں ذرا ٹھیر کر دم لے لو کہ تمھارے ہوش و حواس ٹھکانے آ جائیں۔ چنانچہ فی الحقیقت خمارِ غم کی سرگرانی سے آنکھیں ہماری جو زمین میں لگی ہوئی تھیں، اب ذرا کھلتی معلوم ہوئیں، اور ایک قسم کی خوشی محسوس ہوئی جس نے زبانوں پر تسکین کا مزہ دیا۔ یا تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی تھی، یا ایسا معلوم ہوا گویا ہم چھاؤں میں ہیں۔ یہاں ہم نے اپنے ہمراہیوں کے شمار پر بھی خیال کیا کہ کتنے لوگ جزیرہ میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن کی کثرت سے دل کو ایک اور قسم کی خوشی ہوئی، جس کو تسلی سمجھنا چاہیے۔ ہر چند یہ خوشی کہ اوروں کو مبتلائے غم دیکھ کر حاصل ہوئی تھی، معیوب ہے، مگر اس وقت قابلِ عذر بھی کیونکہ وقت کو خیال کرو۔ یعنی دیکھو کہ ہم خود کس آفت میں مبتلا تھے۔ اسی واسطے ہم کو فقط ان کے حالِ زار پر رحم نہ آیا۔ ہاں یہ افسوس آیا کہ ہائے ہم سب کیسی بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں گرفتار ہیں۔ بلکہ اس میں کچھ اُنسِ انسانیت اور رحمِ ہمدردی بھی شامل تھا۔ اگرچہ دل اس وقت ایسے اندھیرے اور عالمِ مدہوشی

میں تھا کہ اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھے، ہوش میں آتا گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔ بلکہ ایک ایک کو غم گین دیکھ کر پوچھنے لگا کہ ہم کب ملے تھے، اور وہ کیا مصیبتیں تھیں کہ جن کے لیے ہم سب جمع ہوئے تھے۔ ہر ایک نے اپنی سرگزشت بیان کی۔ سارے ماجرے سن کر سب نے ایک دوسرے کی تکلیف کو تولا اور باہم مقابلہ کیا۔ پھر آپس ہی میں رحم کرکے ایک دوسرے کے حال پر بہت افسوس کیے۔ غرض اس طرح غم ناک قافلہ نے رفیقوں کو صبر و تسلّی کے توشے دے کر تھوڑی سی مصیبت کی راہ قطع کی۔ آخر ان درختوں کا تنگ راستہ ذرا کھلنا شروع ہوا اور ہوا بھی کچھ کچھ صاف ہونے لگی۔ تھوڑی دور سے صبح کا سفیدہ غبار کی طرح اڑتا معلوم ہوا۔ وہ ایسا رہ رہ کر ابھرتا تھا، جیسے کہیں دور بجلی چمکتی ہو۔ چمکارے اس کے ذرا ماند تھے، مگر باوجود اس کے دل کو فرحت بخشتے تھے۔ چنانچہ اس ملک میں اُسے دل کا بہلاوا کہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ روشنی زیادہ نظر آنے لگی اور پھر زیادہ تر روشن اور دیر تک ٹھہرنے لگی۔ بعد اس کے وہ آہیں جنھوں نے اب تک زمین و آسمان کو دھواں دھار کر رکھا تھا، نسیم و صبا کی سنسناہٹ بن گئیں، اور تمام جزیرہ پر جو دیو ہیبت کا سا چھایا ہوا تھا وہ بھی کم ہونے لگا۔

اب ہم چلتے چلتے اس پایاب مقام پر پہنچے، جہاں سے ہمیں پار اُترنا تھا۔ یہاں دیکھیں تو وہ ماتم زدے بھی بیٹھے ہیں، جو پہلے ہمارے ساتھ اسے اِدھر اُترے تھے، اور پھر کلبۂ احزان کے دروازہ سے گھبرا کر بھاگے تھے۔ لیکن یہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ جس طرح ساتھ اِدھر آئے تھے، ساتھ ہی پھر دنیا میں دوبارہ پیدا ہوں جب سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی کلبۂ احزان کی تکلیفوں میں شریکِ حال تھے۔ اگرچہ اور طرف پانی بہت گہرا تھا، مگر اِدھر بالکل پایاب تھا۔ جب ہم دریا اُترے، تو تمام دوست آشنا استقبال کو آئے کیونکہ انھیں ہماری عمرِ دوبارہ کی مبارک باد دینے کے لیے تسلّی بلا کر لائی تھی۔ ان میں سے بعض تو ہمیں اتنے دن تک جدا رہنے کے لیے ملامت کرتے تھے بعض

کہتے تھے کہ خیر جو ہوا سو ہوا! پھر اُدھر جانے کا ارادہ نہ کرنا۔ بعض دانش مندوں نے سفر کا حال بھی نہ پوچھا کہ مبادا پھر رنج تازہ ہو جائے۔ مگر یہ ہر شخص نے کہا کہ اگر تقدیر سے ایسا سفر پیش آئے، تو صبر سے بہتر کوئی رفیقِ راہ نہیں۔ یہاں صبر نے چاروں طرف سے اپنی تعریفیں اور شکریہ سُن سُن کر ہمیں تسلی کے سُپرد کر دیا۔ تسلی نے اس پر تبسم کیا۔ تبسم کے ساتھ ہی اُدھر سے آسمان کا رنگ ارغوانی ہو گیا اور شبِ ماتم صبح ہو کر روزِ روشن بن گئی۔